باغی کیمپ
اشتیاق احمد

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں ــــ
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا ــــ
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں ــــ
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا ــــ
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیجیے۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیجیے، پھر ناول پڑھیے۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

چھے پیٹیاں

فرزانہ نے چونک کر اس لمبے آدمی کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ اس کا جملہ اسے عجیب لگا تھا، اس نے کہا تھا:

"آپ نے ایسی سیر زندگی میں پہلے کبھی نہیں کی ہو گی۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" وُہ جلدی سے بولی۔

"ہو سکتا ہے، آپ کو اس سے پہلے بھی بحری جہاز دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے کئی بحری سفر بھی کیے ہوں، جہازوں کی خوب سیر بھی کی ہو، لیکن جس قسم کی سیر مَیں کراتا ہُوں۔ کوئی دُوسرا کرا ہی نہیں سکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" محمود بولا۔

"بات تو خیر ہوئی ہے۔" اور وُہ ایسے کہ۔ مَیں خاص دل چسپی لیتا ہُوں سیر کرانے کے سلسلے میں، جب کہ دوسرے

گائیڈ۔ صرف ان پیسوں سے غرض رکھتے ہیں جو انھیں اس کام کے ذریعے ملتے ہیں۔"

"ہوں۔ گویا پیشہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ آپ کا شوق بھی ہے۔" محمود نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"ہاں بالکل ۔ آئیے اب میں آپ کو جہاز کا ایک بہت ہی خاص حصّہ دکھاؤں۔"

یہ کہہ کر لمبا آدمی اُن کے آگے چلنے لگا ۔ وُہ اس کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھانے لگے ۔ دُوسرے بچّے خوش دکھائی دے رہے تھے ۔ صرف وُہ تین تھے، جو فکرمند تھے؛ لیکن اس بارے میں ابھی تک انھیں کسی بات کا بھی یقین نہیں ہوا تھا وُہ شک کی کیفیت میں تھے ۔

انسپکٹر جمشید کو ایک عدد بحری سفر درپیش تھا ۔ اس سفر کے سلسلے میں انھیں ایک ہفتے کے بعد آنا تھا، محمود، فارُوق اور فرزانہ انھیں رُخصت کرنے بندرگاہ تک آئے تھے ۔ ان کے جہاز پر سوار ہو جانے کے بعد وُہ نیچے پلیٹ فارم پر کھڑے جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ اور انسپکٹر بھی انھیں نظر آ رہے تھے ۔ کبھی کبھی وُہ مُسکرا کر ان کی طرف ہاتھ بھی ہلا دیتے ۔ ایسے میں کسی نے محمود کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ۔ اس نے پلٹ کر

دیکھا تو ایک لمبے قد کا آدمی مُسکرا کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا:

"بحری جہاز کی سیر کریں گے؟"

"ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں ۔ ہمیں تو گھر جانا ہے۔" محمود نے خوش اخلاق لہجے میں کہا۔

"آپ میرا مطلب غلط سمجھے۔" وُہ مسکرایا۔

"وُہ کیسے؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"میں صرف اس وقت تک سیر کرانے کی بات کر رہا ہوں، جب تک کہ جہاز بندرگاہ پر کھڑا ہے ۔ جُوں ہی اس کے چلنے کا وقت ہو گا ۔ میں آپ کو جہاز سے نیچے لے آؤں گا ۔ جہاز کے ایسے ایسے حصّے دکھاؤں گا کہ کیا کبھی آپ کو کسی نے دکھائے ہوں گے۔"

"کیا یہ کام آپ پیشے کے طور پر کرتے ہیں؟"

"ہاں ! یہی بات ہے۔"

"شکریہ ۔ آپ اور گاہک تلاش کریں ۔ ہم بہت جہاز دیکھ چکے ہیں۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"لیکن میرا جہاز کی سیر کرانے کا ایک بہت انوکھا انداز ہے۔" وُہ جلدی سے بولا۔

"ہو گا ۔ ہمیں کیا، ہمیں کوئی دل چسپی نہیں۔"

"اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔" اس نے پریشان

ہو کر کہا۔

"اور بات کیا؟"

"یہ میرا پیشہ ہے — میں ایک غریب آدمی ہوں۔ جہاز کے عملے کے تعاون کے بغیر میں اس قسم کی سیر نہیں کرا سکتا، لہٰذا انھیں بھی اپنی آمدنی کا تیس فی صد حصّہ دینا پڑتا ہے — لیکن اب وُہ آمدنی کا تیس فی صد حصّہ نہیں لیتے — انھوں نے روزانہ کے لیے دو سو روپے مقرر کر دیے ہیں، میرے پاس کچھ بچے نہ بچے — ان کے دو سو روپے انھیں دینا ہوتے ہیں، ورنہ وُہ مجھے سیر کرانے کی اجازت نہیں دیتے — لہٰذا مَیں درخواست کروں گا کہ آپ لوگ بھی سیر کر لیں، ایک غریب آدمی کی مدد ہو جائے گی۔"

تینوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، پھر محمود نے کہا:

"خیر — کوئی حرج نہیں، لیکن آپ فیس کیا لیتے ہیں؟"

"صرف تیس روپے فی کس۔"

"اچھا ٹھیک ہے — ہم آپ کو نوے روپے دے دیتے ہیں، سیر ویر ہم نہیں کریں گے۔"

"تب پھر رہنے دیں — میں اس طرح نہیں لوں گا،

یہ تو بھیک مانگنا ہو گیا۔" اس نے بھنّا کر کہا اور جانے کے لیے مُڑا —

"ٹھہریے بھئی — آپ — بہت اچھے آدمی ہیں — ہم ضرور سیر کریں گے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا — اس کے ہمدردانہ جذبات چھلک پڑے تھے —

اب جو انھوں نے مُڑ کر دیکھا تو انسپکٹر جمشید اپنی جگہ نظر نہ آئے — شاید وُہ کسی کام سے اندر کہیں چلے گئے تھے۔

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

اب وُہ اس کے ساتھ چل پڑے — وُہ انھیں ایک لکڑی کے کیبن کے پاس لایا — کیبن میں جہاز کا عملہ موجود تھا — کیبن کے باہر سائے میں دو لڑکے اور ایک لڑکی بیٹھے تھے — انھیں دیکھتے ہی تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے:

"اوہ — آپ آ گئے — ہم — ہم تو سمجھے تھے —" بڑا لڑکا کہتے کہتے رُک گیا —

"ہاں! میں جانتا ہوں — آپ کیا کہنا چاہتے ہیں — یہ کہ آپ تو مایوس ہو گئے تھے اور یہ خیال کر بیٹھے تھے کہ آپ کے نوّے روپے گئے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں — میں ایک وقت میں کم از کم چھے بچّوں کو لے

جاتا ہوں ۔ اور اب مطلوبہ تعداد پوری ہو گئی ہے ۔ لہٰذا
آئیے چلیں۔"

"جہاز روانہ ہونے میں کتنا وقت ہے؟" محمود بولا ، ساتھ
ہی اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"ایک گھنٹا ۔ اور ایک گھنٹے میں تو آپ کو جہاز کا ہر
گوشہ دکھا دوں گا۔" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ ۔ ابھی تک آپ نے اپنا نام نہیں
بتایا۔" فاروق بولا۔

"میں زوبی ہوں۔"

"زوبی ۔ یہ نام تو شاید زنانہ ہے۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"مردانہ بھی چلتا ہے۔ فکر نہ کریں۔"

اب وہ انھیں لے کر جہاز کی سیڑھی تک آیا اور اوپر
چڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ وہ بچے بھی چڑھنے لگے ۔ جہاز
کے عرشے پر پہنچ کر محمود ، فاروق اور فرزانہ نے ادھر
اُدھر دیکھا ۔ انھیں اپنے والد کہیں بھی نظر نہیں آئے ،
پتا نہیں وہ کہاں تھے ۔ انھیں جہاز کی سیر سے کوئی دلچسپی
نہیں تھی ، کیوں کہ انھوں نے تو نہ جانے کتنے بحری
جہازوں کی اندر سے اچھی طرح سیر کر رکھی تھی ۔ وہ تو
اس غریب آدمی کی مدد کے لیے چلے آئے تھے ۔ لہٰذا

بے توجہی سے سیر کرتے رہے۔ ہاں ان کی نظریں اپنے
والد کو ضرور تلاش کرتی رہیں ۔ لیکن تیرہ چودہ سو آدمیوں
کے جہاز میں ایک آدمی کا نظر آ جانا آسان تو نہیں تھا ،
وہ بھی ایسے میں جب انھیں اپنی جگھوں اور سامان کی
پڑی ہوئی تھی۔

سیر کرتے ہوئے وہ جہاز کی سب سے نچلی منزل میں آ
گئے۔ اس وقت زوبی نے کہا :

"اب میں آپ کو وہ حصّہ دکھاؤں گا جس میں مسافروں
کا سامان رکھا جاتا ہے۔"

"اور جہاز روانہ ہونے میں اب صرف پندرہ منٹ
باقی ہیں۔" محمود نے گویا اسے خبردار کیا۔

"فکر نہ کریں ۔ ہم صرف پانچ منٹ میں سیر مکمل کر
چکے ہوں گے اور صرف تین منٹ میں جہاز سے نیچے
اُتر چکے ہوں گے ۔ جہاز روانہ ہونے سے سات منٹ
پہلے ہم نیچے کھڑے ہوں گے ۔ یہ میرا روز کا کام ہے ،
میں جانتا ہوں ۔ جہاز کے کس حصّے سے ہم کتنی دیر
میں باہر جا سکتے ہیں۔"

"ہوں ! بات تو ٹھیک ہے۔"

"ویسے آپ نے سیر بہت اچھی کرائی۔" فاروق نے یونہی

کر دیا۔

"سیر۔ ابھی کہاں۔ ابھی تو اصلی سیر باقی ہے۔ سیر تو میں ایسی کراؤں گا کہ آپ نے ایسی سیر زندگی میں پہلے کبھی نہ کی ہو گی۔"

یہی وہ الفاظ تھے۔ جن کو سن کر فرزانہ چونک اٹھی تھی۔ اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا:

"جی۔ کیا مطلب؟"

اس کے بعد ان کے ذہن الجھ گئے۔ زوبی بولتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ انہیں لے کر ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں جہاز کا فاضل سامان اور مسافروں کا سامان پڑا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بہت سی بڑی بڑی پیٹیاں رکھی تھیں۔

جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے۔ جہاز نے سیٹی دی ۔ وہ چونک اٹھے۔

"ارے۔ جہاز تو جا رہا ہے۔ وقت سے پہلے۔" دوسری لڑکی نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بھئی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ابھی پہلی سیٹی ہے۔ اس کے دس منٹ بعد دوسری اور پانچ منٹ بعد تیسری سیٹی دی جائے گی۔ پھر جہاز روانہ ہو گا۔ ہم اس سے پہلے ہی باہر ہوں گے۔"

جلد ہی دوسری سیٹی سنائی دی۔

"یہ۔ یہ کیا۔ آپ تو کہہ رہے تھے۔ دس منٹ بعد دوسری اور پھر پانچ منٹ بعد تیسری سیٹی دی جائے گی۔ یہ تو فوراً ہی دوسری سیٹی دے دی گئی۔"

"ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ٹھہریے۔ میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑا۔

"تو آپ ہمیں بھی ساتھ لے جائیے نا۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ آپ لوگ یہیں ٹھہریے۔" اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

اس کے سخت لہجے نے فرزانہ کو اور پریشان کر دیا۔ وہ جلدی سے بولی:

"ایک منٹ مسٹر زوبی۔"

لیکن زوبی اس وقت تک دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے یک دم دروازہ بند کر دیا اور جب وہ ان کی طرف واپس مڑا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

"یہ۔ یہ کیا۔" وہ ایک ساتھ بولے۔ ویسے محمود، فاروق اور فرزانہ پہلے ہی بھانپ چکے تھے کہ ایسی کوئی بات

ہونے والی ہے۔

"اب تم لوگ منہ سے کوئی لفظ نہیں نکالو گے۔ نکالو گے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ آئے گا تو میرا ایک ساتھی۔" اس نے سرد آواز میں کہا۔

"آپ۔ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" بڑا لڑکا کانپ کر بولا۔

"میرے ہاتھ میں جو پستول ہے۔ یہ بھرا ہوا تو ہے ہی۔ بے آواز بھی ہے۔ اگر میں چھے فائر ایک ساتھ کر دوں تو تم چھے کے چھے یہاں ڈھیر ہو جاؤ گے اور کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔"

"لیکن آپ ایسا کیوں کریں گے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"میں ایسا صرف اس وقت کروں گا جب تم کوئی شرارت کرو گے۔ اور اگر تم شرارت نہیں کرو گے تو پھر تم زندہ سلامت رہو گے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" لڑکی بولی۔

"بس۔ صرف چند منٹ۔ ابھی میرا ساتھی۔"

اسی وقت قدموں کی آواز ابھری۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔

"کھول رہا ہوں زیٹی۔ ایک سیکنڈ۔" اس نے کہا، اُلٹے

قدموں دروازے کی طرف بڑھا اور پھر کمر کی طرف ہاتھ لے جا کر چٹخنی گرا دی۔ گویا اس حالت میں بھی اس کا چہرہ ان کی طرف رہا، پستول ان کی طرف اُٹھا رہا۔ ایسے میں فاروق اور فرزانہ حرکت میں آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور نہایت آسانی سے اس پر قابو بھی پا لیتے۔ لیکن محمود نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انھیں منع کر دیا اور بالکل ساکت کھڑے رہنے کا اشارہ کیا۔

دروازہ کھُل گیا۔ ایک اور لمبے قد کا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شریر سی چمک تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کہا:

"چھے ہی ہیں اور پوری طرح صحت مند۔ تمھارا جواب نہیں زوبی۔"

"شکریہ زیٹی۔ اب تم اپنا کام شروع کرو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر زیٹی ان کی طرف بڑھا:

"میں تم لوگوں کے ہاتھ اور پیر باندھوں گا۔ اگر تم لوگوں نے کوئی غلط حرکت کی تو زوبی تمھیں گولی مار دے گا۔ یہاں سے لاش ٹھکانے لگانا بہت ہی آسان ہے۔"

"آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" محمود نے کہا۔

"پہلے ہم تم لوگوں کو باندھیں گے۔ پھر بتائیں گے۔" زیٹی

بولا —

دونوں لڑکوں اور لڑکی کا حال بہت پتلا تھا — ان کے جسموں میں تھرتھری پیدا ہو چکی تھی، آنکھیں ویران نظر آ رہی تھیں۔ زیٹی نے سب سے پہلے ان کی ساتھی لڑکی کو باندھا — پہلے اس کے ہاتھ کمر کی طرف باندھے، پھر دونوں پَیر باندھے — اب وُہ بڑے لڑکے کی طرف بڑھا — اسی طرح ایک ایک کرکے اس نے ان چھے کو باندھ دیا — پھر جیب سے ٹیپ نکالی اور ان کے ہونٹوں پر چپکانے لگا:

"یہ — یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" محمُود نے تیز آواز میں کہا۔

"ہم چاہتے ہیں، آپ لوگ شور نہ مچا سکیں — خاموشی سے اس کمرے میں رہیں۔"

"اور ادھر جہاز چلنے والا ہے — آپ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔" فارُوق بولا۔

"ایک نا معلوم منزل کی طرف۔"

باری باری ان کے منہ بھی بند کر دیے گئے — اب ان دونوں نے مل کر بڑی پیٹیوں کی میخیں اکھاڑیں — اور ہر ایک میں ایک ایک کو لٹاتے چلے گئے — اس طرح چھے پیٹیاں تیار ہو گئیں — ڈھکنے ان کے اوپر جڑنے سے پہلے زوبی نے مُسکرا کر کہا:

"گھبرانے کی ضرورت نہیں — ان پیٹیوں میں ہوا کی آمد و رفت کا انتظام کیا گیا ہے، کیوں کہ تم لوگ مردہ حالت میں نہیں — زندہ حالت میں ہمارے لیے مفید ہو — اور تمہیں صرف دس گھنٹے تک سفر کرنا پڑے گا — دس گھنٹے بعد اس بحری جہاز سے یہ چھے پیٹیاں اور کچھ دُوسرا سامان ایک چھوٹی سی ریاست کی بندرگاہ پر اتار دیا جائے گا — یہ ریاست دراصل ایک جزیرہ ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی پیٹیوں کے ڈھکنے بند کیے جانے لگے —

رحم کی بھیک

دس گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز ایک جزیرے کے کنارے آ لگا۔ اس وقت انسپکٹر جمشید عرشے کی ریلنگ سے لگے کھڑے تھے اور سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ اس سے اگلی منزل پر انھیں بھی جہاز سے اُترنا تھا اور وہاں جانا تھا جہاں کے لیے یہ سفر کیا گیا تھا۔ عملے کا ایک شخص ان کے قریب سے گزرا تو وہ بول اُٹھے:

"کیوں جناب۔ کیا جہاز یہاں کچھ دیر رُکے گا؟"

"جی ہاں! یہاں کا کچھ سامان جہاز پر موجود ہے۔ وہ سامان اتارا جائے گا اور قریباً آدھ گھنٹا لگ جائے گا۔"

"کیا اس دوران ہم لوگ اس جزیرے کی سیر نہیں کر سکتے۔"

"جی نہیں۔ جزیرے کی حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ غیر مُلکی لوگ ان کی سرزمین پر قدم رکھیں۔"

"اوہ اچھا۔" انھوں نے کندھے اچکا دیے اور پھر سمندر کی موجوں پر نظریں جما دیں۔

جلد ہی سامان اُتارا جانے لگا۔ لکڑی کی کچھ پیٹیاں بھی ان کے سامنے سے لے جائی گئیں۔ اسی وقت ان کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نظر آئے۔ وہ قدرے بے چین ہو گئے۔ انھوں نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پیشانی پر لکیریں اُبھر آئیں، دل کی دھڑکن قدرے بڑھ گئی۔

انھوں نے پاس سے گزرنے والے عملے کے ایک آدمی سے کہا:

"اس جزیرے کا کیا نام ہے جناب؟"

"جزیرہ۔ انومان۔"

"شکریہ!"

ان کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ پہلے انھوں نے پورے عرشے کا ایک چکر لگایا۔ اور پھر نچلی منزل پر پہنچے۔ نچلی منزل کو بھی غور سے دیکھا۔ پھر درمیان والی منزل میں آئے۔ اس کو بھی غور سے دیکھا۔ پھر سب سے نچلی منزل میں جانے کے لیے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ اچانک ان کے قدم رک گئے۔ ان کی پیشانی کی لکیریں اور اُبھر آئیں، ایک سیڑھی پر ایک عدد رومال پڑا تھا۔ اور وہ اچھی

طرح جانتے تھے کہ وہ رومال فاروق کا ہے۔ چند سیکنڈ تک وہ رومال کو گھورتے رہے، پھر جھک کر اسے اٹھا لیا اور سونگھا۔ اس میں سے اس کی پسندیدہ خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اور نیچے اترے۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی انھیں بالوں کی پن پڑی نظر آئی۔ یہ پنیں ایک سہیلی کی طرف سے تحفے میں ملی تھیں اور خاص قسم کی تھیں۔ انھوں نے پن کو بھی اٹھا لیا اور مزید آگے بڑھے۔ ایک بڑے کمرے کے دروازے کے ایک طرف انھیں ایک پنسل تراش پڑا نظر آیا۔ یہ محمود کا تھا۔

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ جہاز پر موجود ہیں۔ یا رہے ہیں۔ لیکن کیوں۔ وہ تو نیچے کھڑے ہوئے تھے اور جہاز کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ارے ہاں۔ میں کسی کام سے اندر چلا گیا تھا۔ دوبارہ عرشے پر آیا تو وہ وہاں کھڑے نظر نہیں آئے تھے۔ تو کیا وہ اوپر آ گئے تھے۔ لیکن کیوں۔ انھیں اوپر آنے کی کیا ضرورت تھی۔" یہ الفاظ انھوں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہے۔

تینوں چیزیں جیب میں ڈال کر مڑنے ہی لگے تھے کہ رک گئے اور اس کمرے کے دروازے کو دبا کر دیکھا، جس

کے قریب پنسل تراش ملا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو گئے اور ایک بار پھر ان کی الجھن میں اضافہ ہونے لگا۔ اندر بھی وہ خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔

"تت۔ تو وہ یہاں ہیں۔"

اب انھوں نے پورے ہال کا جائزہ لیا۔ ان سیٹوں کو بھی دیکھا۔ جو خالی پڑی تھیں۔ اسی وقت قدموں کی آواز ابھری اور ایک لمبے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ انھیں اندر دیکھ کر چونکا:

"کیا بات ہے جناب۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا یہاں کچھ بچے آئے تھے؟" انھوں نے فوراً کہا۔

"بچے۔ جی ہاں! بالکل آئے تھے۔ لیکن یہ تو اس وقت کی بات ہے۔ جب جہاز ابھی ہمارے ملک کی بندرگاہ پر کھڑا تھا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ بولے:

"لیکن وہ بچے یہاں کیوں آئے تھے؟"

"جہاز کی سیر کرنے۔ کچھ بچے سیر کرنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ ہم ان معصوموں کو منع نہیں کرتے۔" اس نے کہا۔

"اوہ اچھا۔" انھوں نے مطمئن ہو کر کہا۔ گویا بات صرف اتنی تھی کہ محمود، فاروق اور فرزانہ جہاز کی سیر کرنے کے لیے

یہاں تک آ گئے تھے۔ لیکن ـ

اس لیکن سے آگے ان کی سوچ کی گاڑی اٹک گئی ـ کیوں کہ اس لیکن کے بعد انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ عام حالات میں محمود، فاروق اور فرزانہ اپنی چیزیں نہیں گرا سکتے تھے۔ چیزیں وہ ہمیشہ اس وقت گراتے تھے، جب کسی خطرے میں گھر گئے ہوں۔ گویا وہ تینوں خطرے میں گھرے ہوئے تھے:

"کیا سوچنے لگے جناب؟" لمبے آدمی نے تنگ آ کر کہا۔

"وہ۔ وہ کتنے بچے تھے؟"

"آخر آپ ان بچوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے جناب؟"

"میں ان کے پیچھے ہرگز نہیں پڑا۔ بلکہ شاید وہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ وہ یہاں کہاں۔ وہ تو سیر کر کے بندگاہ پر اتر گئے تھے۔"

"بندرگاہ سے کچھ سامان اس کمرے میں بھی لا کر رکھا گیا تھا۔"

"جی ہاں! لکڑی کی چھ پیٹیاں۔" اس نے کہا۔

"وہی پیٹیاں۔ جو یہاں اتاری گئی ہیں۔"

"جی۔ جی ہاں۔ وہی۔" اس نے کہا۔

"اور ان پیٹیوں میں کیا تھا؟"

"یہ ہمیں نہیں معلوم جناب۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ اب ان کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ جہاز نے اسی وقت سیٹی دی۔ وہ اوپر عرشے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جہاز وہاں سے بھی روانہ ہو چکا ہے۔ اب وہ کپتان کے دفتر کی طرف بڑھے۔ جہاز پر ان کی موجودگی کے بارے میں کپتان کو معلوم تھا اور اسے ہدایات بھی مل چکی تھیں، لہٰذا اس نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا:

"آئیے انسپکٹر صاحب۔" کپتان نے آگے بھی کچھ کہنا چاہا۔ لیکن انھوں نے بات کاٹ دی:

"مہربانی فرما کر۔ آگے کچھ نہ کہیے گا۔"

"گگ۔ کیوں۔ کیا ہوا؟"

"میں یہ سفر خفیہ طور پر کر رہا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہوائی جہاز سے سفر کر سکتا تھا۔"

"اوہ سمجھا۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا نام یہاں کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"ہاں! میں یہی چاہتا ہوں۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ جہاز جب بندرگاہ پر کھڑا ہوتا ہے۔ تو کیا اس وقت کچھ

لوگوں کو جہاز کی سیر کی اجازت ہوتی ہے؟"

"ہاں! ہم نے یہ اجازت دراصل طالب علم حضرات کی دل چسپی کے لیے دی ہے، لیکن اس سے پیشہ ور قسم کے لوگوں نے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ خاص طور پر قلی قسم کے لوگوں نے۔" کپتان نے کہا۔

"کیا مطلب ۔ میں سمجھا نہیں۔"

"وہ گائیڈ بن کر پھرتے رہتے ہیں اور کچھ طالب علم نظر آ جائیں تو انھیں جہاز دیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان سے وہ باقاعدہ فیس وصول کرتے ہیں۔ اور اوپر لا کر انھیں جہاز دکھاتے ہیں۔"

"آپ ان لوگوں کو ایسا کیوں کرنے دیتے ہیں؟"

"اس میں دراصل ہمیں بھی آسانی ہے۔ یہ لوگ جہاز کے ہر حصّے کے واقف ہیں۔ جلدی جلدی سیر کرا کے جہاز سے نیچے بھی لے جاتے ہیں۔ ورنہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ طالب علم نچلی منزل میں جہاز دیکھنے میں مصروف ہوں ۔ اور جہاز روانہ ہو جائے ۔ نیچے تو انھیں پتا ہی نہیں چلے گا۔"

"اوہ اچھا ۔ میں سمجھ گیا۔" انھوں نے فکر مندانہ انداز میں کہا، پھر بولے:

"اس جزیرے کے لیے کچھ سامان بک کرایا گیا تھا؟"

"ہاں! لکڑی کی چند پیٹیاں ۔ جن میں روزمرہ استعمال کی مصنوعات بھری ہوئی تھیں۔"

"میں آپ کے دفتر سے اپنے دفتر رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

"ضرور۔ یہ کچھ مشکل نہیں۔"

رابطہ قائم ہونے کے بعد انھوں نے اکرام سے کہا:

"ہیلو اکرام ۔ گھر فون کر کے معلوم کرو ۔ محمود، فاروق اور فرزانہ گھر پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔"

"او کے سر۔" اس نے کہا۔ پانچ منٹ بعد اس نے کہا:

"جی نہیں ۔ ابھی نہیں پہنچے ۔ بیگم صاحبہ ان کے لیے بہت فکر مند ہیں۔"

"ان سے کہ دینا کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے ایک مہم پر روانہ ہو گئے ہیں۔ جلد لوٹ آئیں گے۔"

"لیکن یہ بات ہے نہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا سر۔" اکرام نے کہا۔

"نہیں بھئی ۔ میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"او کے سر۔"

اور سلسلہ کاٹ کر وہ کپتان کی طرف مڑے ۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر عرشے پر آ گئے ۔ کچھ دیر سوچ میں گم رہے ۔ آخر انھوں نے ایک فیصلہ کیا ۔ اپنے اس فیصلے سے کپتان کو آگاہ کیا ۔

انسپکٹر جمشید ایک بار پھر جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے اور جزیرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے ۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے ان کی کوئی قیمتی چیز اس جزیرے میں رہ گئی ہو ۔

★

پیٹیوں کو ایک بڑی اور بند گاڑی میں لاد کر ساحل سے جزیرے میں لے جایا گیا ۔ پیٹیوں میں انھیں آدھ گھنٹے تک مزید سفر کرنا پڑا ۔ پھر پیٹیوں کے تختے اکھاڑے جانے لگے ۔ قریباً گیارہ گھنٹے تک وہ ان میں بند رہے تھے ، وہ بھی بندھی ہوئی حالت میں ۔ یہ وقت جس طرح گزرا ، کچھ وہی جانتے تھے ۔ ان کی حالت تو پھر کچھ زیادہ گئی گزری نہیں تھی ۔ ان کے ساتھی تینوں بچے ادھ موئے نظر آ رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ان میں اب زندگی

کی لہر نہیں دوڑے گی ۔

تاہم آہستہ آہستہ وہ دیکھنے ، سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہو گئے ۔ انھوں نے ارد گرد کا جائزہ لیا ، وہ ایک کمرے کے پختہ فرش پر پڑے تھے ۔ ان کی رسیاں کھول دی گئی تھیں ، ایک کونے میں پانی اور بسکٹ وغیرہ پڑے تھے ۔ ان چیزوں کو دیکھ کر بھوک اور پیاس چمک اٹھی ۔ وہ چھے کے چھے ان چیزوں پر جھپٹے ۔ چیزیں زیادہ نہیں تھیں ۔ یہ بات محسوس کرتے ہی محمود نے کہا :

" نہیں فاروق ۔ فرزانہ ۔ تم ٹھہر جاؤ ۔"

" ہاں ! ٹھیک ہے ۔" فاروق بولا ۔

وہ تینوں بسکٹ وغیرہ کھاتے رہے ۔ پانی پیتے رہے ۔ پھر اچانک لڑکی نے کہا :

" آپ لوگ کیوں رک گئے ؟"

" تاکہ تم لوگ پہلے پیٹ بھر لو ۔ اگر کچھ بچ گیا تو ہم بھی کھا لیں گے ۔ ورنہ خیر ۔" محمود بولا ۔

" آپ ۔ آپ بہت اچھے ہیں ۔ یہ بات ہم نے جہاز میں بھی محسوس کی تھی ۔"

" اچھی تو بس ایک اللہ کی ذات ہے ۔"

" جج ۔ جی ہاں ۔ یہ تو ہے ۔ آپ کے نام کیا ہیں ؟"

"میں محمود ہوں - یہ فاروق اور فرزانہ ہیں۔" اس نے تعارف کرایا -

"اور میرا نام ذاکر ہے - یہ شاکر اور سیما ہیں۔" بڑے نے تعارف کرایا -

"آخر یہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے ؟" شاکر بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آسکا - لیکن ہمارا ایک اندازہ ہے - اور وہ اندازہ اخبارات کی خبروں کی بنیاد پر ہے۔"

"وہ - کیا ؟" سیما بولی۔

"سکولوں کے طالب علم غائب ہو جانے کی خبریں اخبارات میں بہت پڑھنے میں آتی ہیں - ہم بھی سکول کے طالب علم ہیں - شاید ہمیں اغوا کیا گیا ہے۔"

"اوہ !" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اور اغوا کر کے ہمیں اپنے ملک سے باہر کہیں پہنچا دیا گیا ہے - پتا نہیں یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"کچھ بسکٹ اور پانی بچ گیا ہے - آپ بھی لے لیں۔" شاکر نے کہا -

"یہ چیزیں بچیں نہیں - آپ نے جان بوجھ کر بچائی ہیں، میرا خیال ہے - آپ ہی پیٹ بھر لیں۔"

"نہیں نہیں - یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" سیما نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔

اور انھیں پانی اور بسکٹوں کی طرف ہاتھ بڑھانے پڑے :

"ان چیزوں کی مقدار دیکھ کر کم از کم ہم ایک اندازہ لگانے کے قابل ہو گئے ہیں - اور وہ یہ کہ جن لوگوں کے حوالے ہمیں کیا گیا ہے - وہ کچھ بے رحم لوگ ہیں - ورنہ اس وقت تو ہمیں اچھا بھلا کھانا دینا ہی چاہیے تھا۔"

"اوہ !" وہ بولے۔

"لیکن خیر - ہم رحم کی بھیک نہیں مانگیں گے۔" محمود نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

اسی وقت دروازہ کھلا -

پہلی کوشش

اندر داخل ہونے والے تین لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کوڑے تھے۔ جنھیں دائرے کی شکل میں پلیٹ کر ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں سے شیطینت ٹپک رہی تھی۔

"تم لوگ ہوش میں آگئے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"اوہو! یہ تو بسکٹ اور پانی بھی صاف کر چکے ہیں۔" دُوسرا چہکا۔

"گویا کام کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔" تیسرا مسکرایا۔

"آپ۔ کون لوگ ہیں اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" فارُوق جلدی سے بولا۔

"ان کی رسید کہاں ہے۔" پہلے نے جیسے اس کی بات سُنی ہی نہیں۔ اس نے اپنے دُوسرے ساتھی سے کہا۔

"باس کے پاس۔"

"کتنی رقم کی رسید ہے؟"

"ساٹھ ہزار روپے۔"

"یعنی دس چھکے ساٹھ۔ ہر ایک کے دس دس ہزار روپے۔" دُوسرے نے کہا۔

"ہاں! دس دس ہزار روپے۔" تیسرا بولا۔

"پتا نہیں۔ آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔" محمود بڑبڑایا۔

"تم صرف اتنا جان لو کہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہنا ہو گا۔" پہلے نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا مرنے کے بعد بھی۔"

"نہیں! مرنے کے بعد تم لوگ مکمل طور پر آزاد ہو گے، جہاں چاہو، جا سکو گے۔ ہم تو صرف تم لوگوں ک تک کی بات کر رہے ہیں۔"

"شکریہ! ہماری زندگیاں تو پہلے ہی دین اور اپنے مُلک کے لیے وقف ہیں۔ گویا یہ ہمارے لیے نئی بات نہیں ہو گی۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"ہوں۔ تم لوگ قدرے دلیر معلوم ہوتے ہو، لیکن سب کے سب نہیں۔ تم میں سے نصف دلیر ہیں اور نصف بزدل۔"

"آپ ہماری بزدلی اور دلیری پر بات کرنے کی بجائے یہ بات کریں کہ آپ چاہتے کیا ہیں۔"

"واقعی یہ لوگ بہت دلیر ہیں ۔ آج تک یہاں آنے والوں نے اتنی بے خوفی سے باتیں نہیں کیں ۔" دُوسرا بولا ۔

"باس کے آنے سے پہلے ہمیں ان لوگوں کو کام پر لگا دینا چاہیے ۔ ناشتا تو یہ کر ہی چکے ہیں ۔" تیسرے نے کہا ۔

"ہوں ٹھیک ہے ۔ چلو بھئی اُٹھو ۔"

وُہ اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ ذاکر ، شاکر اور سیما کی آنکھوں سے کبھی کبھی آنسو بہنے لگتے ۔ لیکن ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا ۔

باہر نکل کر انھوں نے دیکھا ۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک خوب صورت سا مکان بنایا گیا تھا ، اس مکان میں ہی وُہ اب تک رہے تھے ۔ پہاڑی کے دامن میں انھیں سیکڑوں لوگ کام کرتے نظر آئے ۔ ان سب کے ہاتھوں میں ہتھوڑے تھے ، وُہ ان ہتھوڑوں سے بڑے بڑے پتھر توڑ رہے تھے ۔ یعنی بڑے پتھروں کو چھوٹے پتھروں میں تبدیل کر رہے تھے ۔ انھوں نے ایسے پتھر سڑک بنانے کے لیے استعمال ہوتے دیکھے تھے ۔

"اُف مالک ۔ کیا ہم کسی بیگار کیمپ میں ہیں ۔" محمود نے کانپ کر کہا ۔

"بالکل ٹھیک سمجھے ۔" ایک نے کہا ۔

"بب ۔ بیگار کیمپ ۔" شاکر کی آواز لڑکھڑا گئی ۔

"ہاں ! یہاں تم لوگ صبح سے شام تک پتھر توڑا کرو گے ۔ مغرب کے بعد چھٹی ہوا کرے گی ۔ دوپہر کو کھانے کی چھٹی بھی ملے گی ۔ آدھ گھنٹے کے لیے ۔ مغرب کے بعد تم لوگ سو سکتے ہو ۔ ایک دُوسرے سے ہنس بول سکتے ہو ۔"

"کیا بیگار کیمپوں میں بھی لوگ ہنس بول لیتے ہیں ۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا ۔

"ہاں ۔ جب یہاں رہتے ہوئے کافی مدت گزر جاتی ہے تو پھر مقدر جان کر ہنسنے بولنے بھی لگ ہی جاتے ہوں گے ۔" محمود بولا ۔

"آپ لوگ کس رسید کا ذکر کر رہے تھے ۔ ساٹھ ہزار کی بھی بات ہوئی ہے ۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ اغوا کرنے کا کام ہم خود نہیں کرتے ۔ بچّوں کو اغوا کرنا اور فن ہے ۔ کچھ لوگ ہمارے لیے یہ کام کرتے ہیں ۔ زوبی اور زیٹی ان میں سے دو ہیں ۔ ایسے اور آدمی بھی ہیں ۔ ان لوگوں سے باقاعدہ ہم بچّے خریدتے ہیں ۔"

"کیا !" وُہ اُچھلے اور رُک کر انھیں گھورنے لگے ۔

"رُکا نہیں کرتے ۔ چلتے رہو ۔" ایک نے غرّا کر کہا ۔

"تت۔ تو۔ آپ لوگوں نے ہمیں ان لوگوں سے خریدا ہے۔"

"ہاں خریدا ہے۔ تم میں سے ہر ایک کے دس دس ہزار روپے دیے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

لمحہ بہ لمحہ وہ پتھر توڑنے والوں کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا:

"ساتھیو! خوش ہو جاؤ۔ چھے ساتھی اور آ گئے ہیں، ان لوگوں کی آمد پر تین منٹ تک پورے زور شور سے ہتھوڑے چلاؤ۔"

چند لمحے کے لیے ان سب کے ہاتھ رک گئے۔ ان کی نظریں ان چھے پر پڑیں اور پھر ان کے ہاتھ زور شور سے چلنے لگے۔ یہ کم از کم خوشی کا اظہار نہیں تھا۔ غم اور غصے کا ہو سکتا تھا۔

"تین ہزار بچے اور بڑے تو ضرور ہوں گے یہاں۔" محمود بڑبڑایا۔

پتھر کوٹے جانے کی آوازوں میں اس کی آواز ابھر نہ سکی اور صرف فاروق اور فرزانہ سن سکے۔

"ہاں تو پھر۔"

"اگر یہ سب مل کر ان نگرانوں پر ٹوٹ پڑیں تو ان

کی ہڈیوں کو بھی سرمہ بنا دیں۔"

"لیکن ٹوٹ کیسے پڑیں۔ اتنی ہمت کہاں سے لائیں۔ اور پھر چاروں طرف پہاڑوں پر رائفل بردار نگران چوکس کھڑے ہیں۔ بھلا وہ انھیں من مانی کرنے دیں گے۔ ہرگز نہیں۔"

"بس۔ کافی استقبال ہو چکا۔ رک جاؤ۔" ان کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک کی آواز گونجی۔ اور میدان میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔

اسی وقت ایک آدمی ٹرے میں کچھ اٹھائے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹرے پر کپڑا ڈھانپا گیا تھا۔ نزدیک پہنچنے پر کپڑا اٹھا دیا گیا۔ انھوں نے دیکھا۔ ٹرے میں چار ہتھوڑے رکھے تھے۔

"شاباش! ایک ایک اٹھا لو۔ انکار کیا تو پھر تم ہو گئے اور کوڑے ہوں گے۔ ان میں سے اکثر پہلے بہت بگڑے تھے، مچلے تھے، روئے تھے۔ چیخے تھے، چلائے تھے۔ لیکن دیکھ لو۔ اب کس تیزی سے ان سب کے ہاتھ چل رہے ہیں، دراصل ان کوڑوں کی تاب کوئی ایک دن لاتا ہے۔ کوئی دو دن اور زیادہ کوئی سخت ہوا تو تین دن۔ چوتھے دن جوں ہی کوڑے والا ہاتھ بلند ہوتا ہے۔ وہ ہتھوڑا ہاتھ میں

پکڑ لیتا ہے۔ لہٰذا اگر کوڑے کھانے کا شوق ہے تو ہتھوڑے نہ اٹھاؤ۔"

"لیکن یہ تو چار ہیں۔ جب کہ ہم چھے ہیں۔"

"کیا ان سب میں کچھ لڑکیاں کام کرتی نظر آ رہی ہیں؟"

"نن۔ نہیں۔" شاکر بولا۔

"بس تو پھر۔ سمجھ لو کہ ہم لڑکیوں سے یہ کام نہیں کراتے۔"

"پھر لڑکیوں کو کیوں خریدتے ہیں؟"

"اس لیے کہ ان ہزاروں لوگوں کا کھانا پکانے والا بھی تو کوئی ہونا ہی چاہیے۔ لڑکیاں باورچی خانہ سنبھالتی ہیں، یہ دونوں یہاں تم لوگوں کو کام شروع کرتے دیکھ کر باورچی خانے کا رُخ کریں گی۔"

"ہوں! ہم سمجھ گئے۔" محمود نے کہا اور ہتھوڑا اُٹھا لیا۔ فاروق نے بھی دیر نہ لگائی۔ ذاکر اور شاکر کے ہاتھ ہتھوڑا اُٹھاتے ہوئے بہت لرزے۔

"اُٹھا لو بھئی۔ اُٹھا لو۔" محمود نے کہا۔

آخر انھوں نے بھی ہتھوڑے اُٹھا لیے۔ اور پتھروں کے بڑے ڈھیر کے کنارے جا کر بیٹھ گئے۔

"خیال رہے پتھر ایک جتنے بڑے ٹوٹیں۔ یہ نہیں کوئی بہت بڑا اور کوئی بالکل چھوٹا ہو۔ ایسے مال کی مانگ نہیں ہے۔"

"تجربہ ہوتے ہوتے ہی ہوگا۔" محمود نے منہ بنایا۔

پھر ان کے ہاتھ اُٹھنے لگے۔

"تم چھے چوں کہ ایک ساتھ یہاں پہنچے ہو۔ اس لیے ایک کمرے کا نصف حصّہ تمھیں سونے کے لیے دیا جائے گا، اس کمرے میں پہلے ہی چار لڑکے اور دو لڑکیاں سوتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" محمود نے کہا۔

اور وہ تینوں فرزانہ اور سیما کو لے کر وہاں سے چل دیے۔ وہ مُڑ مُڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ ذاکر اور شاکر نے بھی ان کی طرف دیکھا، لیکن محمود اور فاروق نے آنکھیں اوپر نہیں اُٹھائیں۔

ان کی زندگی کا یہ دن جب تمام ہوا۔ سورج غروب ہونے کے قریب ہوا تو کام بند کر دیا گیا۔ ان کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس قسم کی محنت انھوں نے کب کی تھی۔

"سب لوگ کھانے کے لیے چلو۔" ایک آواز گونجی۔

انھیں بہت بڑے بڑے تین چار ہال کمروں کی طرف

لایا گیا ۔ یہاں فرش پر چٹائیاں بچھائی گئی تھیں ۔ ان پر کھانوں
کی پلیٹیں اور روٹیاں پہلے ہی موجود تھیں ۔ وہ اندر داخل ہو
گئے اور بیٹھنے لگے ۔ ایسے میں ایک آواز گونجی :

" اتنا خیال رہے ۔ ہر ایک کے حصے میں دو روٹیاں آئیں
گی ۔ کوئی بھی تیسری روٹی توڑنے کی کوشش نہیں کرے گا،
ورنہ تمھارا کوئی ساتھی ایک روٹی پر ہی گزارا کرے گا۔"

کھانا شروع ہوا ۔ فارغ ہونے والے باہر نکل نکل کر
پتھریلی زمین پر لیٹتے گئے ۔ صبح سے انھیں اب کمر سیدھی
کرنے کا موقع ملا تھا ۔ لیکن محمود اور فاروق نے کمر سیدھی
کرنے کی بجائے نماز ادا کرنا ضروری خیال کیا ۔ ان کی
دیکھا دیکھی ذاکر اور شاکر نے بھی وضو کیا اور نماز پڑھنے
لگے ۔ پھر کیا تھا ۔ کتنے ہی ان کے ساتھ شامل ہو گئے
اور جو نہیں ہوئے ۔ وہ انھیں حیرت بھری نظروں سے
دیکھنے لگے ۔ سلام پھیر کر محمود نے کہا :

" تم لوگ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو۔"

" اس لیے کہ ہمیں نہ جانے کتنا کتنا عرصہ ہو گیا یہاں
آئے ہوئے ۔ بھول کر بھی نماز کا خیال نہیں آیا۔"

" اسی لیے تو یہاں سے نکل نہیں سکے تم لوگ۔"
محمود مسکرایا ۔

" کیا مطلب ؟"

" کک ۔ کچھ نہیں۔" محمود نے فوراً کہا۔

اسی وقت ایک آواز گونجی ۔

" نئے آنے والے چھے بچے ۔ میرے نزدیک آجائیں۔"

انھوں نے دیکھا ۔ وہ ایک پہلوان نما آدمی تھا ۔ وہ
چاروں تو فوراً ہی اس کے نزدیک پہنچ گئے ۔ فرزانہ اور سیما
کچھ منٹ بعد پہنچ سکیں ۔ لڑکیاں دوسری طرف جمع تھیں،
فرزانہ کے کپڑے کالے ہو چکے تھے ۔ ہاتھوں اور منہ پر
بھی جا بجا کالک لگی ہوئی تھی ۔

" تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اس کے پیچھے چل پڑے ۔ پندرہ منٹ بعد وہ
ایک منزلہ بنی ہوئی بہت طویل عمارت کے پاس آئے ۔
پہلوان انھیں عمارت کے ایک کمرے میں لے آیا ۔
اس کا نمبر ۱۰۱ تھا ۔

" اس کمرے کا نصف حصہ تمھارا ہے ۔ پہلے سے جو
چھے بچے یہاں رہ رہے ہیں ۔ وہ ابھی جلد ہی آجائیں گے،
تم لوگ بھی اگر باہر گھومنا پھرنا پسند کرو تو کسی کو کوئی
اعتراض نہیں ہوگا۔"

" شکریہ !" انھوں نے کہا۔

پہلوان نما آدمی جانے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ محمود بول اُٹھا :

"کیا آپ پہلوان ہیں ؟"

"نہیں۔ بس میرا جسم پہلوانوں جیسا ہو گیا۔"

"آپ باس کے ساتھی ہیں؟"

"نہیں ! میں بھی تم لوگوں کی طرح اس کیمپ کا قیدی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مدّت پہلے یہاں لایا گیا تھا۔ اس وقت سے یہاں ہوں۔"

"اوہ!" ان کے مُنہ سے ایک ساتھ نِکلا۔

"کیا یہاں سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کی؟"

"میں نے تو کم از کم نہیں کی ، کیوں کہ میں ذرا بُزدل آدمی واقع ہوا ہوں۔ ہاں ! بہت سے بچّے کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن کامیاب ایک بھی نہیں ہوا۔ ان لوگوں کے حفاظتی انتظامات بہت زبردست ہیں۔ ہم لوگوں کو تو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ نِکلنا کِس طرف سے ہے۔ نکل بھاگنے کی کوشش کرنے والے ابھی اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ انھیں پکڑ لیا جاتا ہے۔"

"ہُوں۔ لیکن اگر سب مل کر کوشش کریں؟" فاروق نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"سب ہمت کہاں سے لائیں۔" اس نے کہا۔

"ہمارا اندازہ ہے کہ اگر سب لوگ مل کر اپنے ہتھوڑوں سے ان پر پِل پڑیں تو ان کی ہڈیاں بھی نہ بچیں۔"

"لیکن ہمت کہاں سے لائیں۔ فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں کا بعد میں جو انجام ہوتا ہے۔ وُہ ہر وقت سب کی آنکھوں میں ناچتا رہتا ہے۔"

"کیا مطلب۔ ایسوں کے ساتھ یہ کیا کرتے ہیں؟"

"خار دار تاروں کی باڑھ کے ساتھ انھیں باندھ دیا جاتا ہے۔ تمام دن وُہ بندھے رہتے ہیں۔ صبح ہی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے ساتھ انہیں گولی مار دی جائے گی۔ چنانچہ گولی مار دی جاتی ہے۔ پھر ان کی لاشیں تاروں سے ہی لٹکتی رہتی ہیں۔ جب وُہ بدبُو چھوڑنے لگتی ہیں ، تب انھیں اتار کر کھائیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔"

"اُف مالک۔" شاکر کے منہ سے نِکلا۔

وُہ پہلوان کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وُہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو یسما کی لرزتی آواز سُنائی دی :

"یہ۔ یہ ہم کس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔"

"آئیے۔ اپنے کمرے میں چل کر باتیں کریں۔ یہاں بات چیت کرنا مناسب نہیں رہے گا۔" محمود نے ان سے کہا۔

"ہمارے لیے یہ بات بھی کچھ کم حیرت ناک نہیں کہ آپ لوگ نہ تو گھبرائے ہوئے نظر آئے ہیں۔ نہ بوکھلائے ہوئے۔ نہ ہم نے آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔"

"ہم ذرا صابر قسم کے واقع ہوئے ہیں۔"

"لیکن ہم لوگوں کے ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔" ذاکر بولا۔

"پھر بھی صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں تو دراصل سوچنا یہ ہے کہ یہاں سے نکلیں کیسے۔"

"کیا آپ سن نہیں چکے۔ فرار کی کوشش کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

"ہاں! سن چکے ہیں۔ لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم جد و جہد ضرور کریں گے۔ کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام۔ یہ اس کی مرضی ہے۔"

اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہوں! میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"اس ترکیب کا شکریہ۔ جو ان حالات میں بھی تمہارے ذہن میں آنا نہیں بھولی۔"

"کس کا شکریہ۔" فرزانہ نے بے دھیانی کے عالم میں کہا۔

"اس ترکیب کا۔ اور کیا۔"

"ارے بھئی۔ تم میرا شکریہ ادا کرو۔ یا پھر میرے ذہن کا۔ نہ کہ اس ترکیب کا۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شکریے کی اس حد تک بھوکی ہو۔ خیر۔ شکریہ۔"

"بھئی یہ باتیں تو ہم پھر بھی کر لیں گے۔ ترکیب سن لو پہلے۔"

اور فرزانہ نے اپنا منہ پہلے فاروق کے کان سے لگایا، پھر محمود کے کان سے۔ کچھ دیر بعد بچے سونے کے لیے آنے لگے۔ اور بے سدھ ہو کر فرش پر گرتے چلے گئے، لیکن انھوں نے پہلے نماز ادا کی اور اس کے بعد اپنے پروگرام کے مطابق سونے کے لیے لیٹ گئے۔

سب بچوں اور بڑوں کو صبح چھے بجے بیدار ہونا تھا۔

نگران آ کر انہیں کوڑے مار مار کر اُٹھاتے تھے ۔ تب کہیں
جا کر ان کی آنکھیں کھلتی تھیں ۔ یہ بات انہیں کئی بچوں
نے بتائی تھی ۔ لیکن وُہ چار بجے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے،
یہی ارادہ کر کے سوئے تھے ۔ اور یہ ان کی خاص عادت
تھی کہ جتنے بجے کا ارادہ کر کے سوتے ۔ ٹھیک اسی وقت
آنکھ کھُل جاتی تھی ۔ انھوں نے دیکھا ۔ ان کے نو کے
نو ساتھی گہری نیند میں غرق تھے ۔ اور وہی کیا ۔ شاید
سبھی گہری نیند میں غرق تھے ۔ وُہ ان کے درمیان سے
ہو کر عمارت سے باہر نکل آئے ۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں ۔
ہر طرف سے سرچ لائٹیں عمارت پر پڑ رہی تھیں ۔
اور ان کی زد سے بچ کر پہاڑوں تک پہنچنا بہت مشکل
تھا ۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ پہاڑوں پر اس وقت کوئی
موجود بھی ہے یا نہیں ۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس وقت
نگران بھی سو جاتے ہوں ۔ یہ خیال کر کے کہ سب قیدی
تو گہری نیند سو رہے ہیں ۔ انہیں جاگنے کی کیا ضرورت ہے۔

" آج ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ پہاڑوں پر اس
وقت نگران ہوتے ہیں یا نہیں ، اگر ہوتے ہیں تو چوکس
بھی ہوتے ہیں یا پڑے سو رہے ہوتے ہیں۔" محمود نے
دبی آواز میں کہا۔

" لیکن ہم یہ کس طرح معلوم کر سکتے ہیں ۔ جب کہ سرچ
لائٹوں کی وجہ سے اس طرف دیکھنا قریب قریب ناممکن
ہے۔" فارُوق نے کہا۔

" سرچ لائٹوں کے دُوسری طرف جا کر۔" فرزانہ نے کہا۔

" کیا یہ آسان ہو گا۔"

" آسان ہو یا مشکل ۔ ہمیں یہ کام کرنا ہی ہو گا ۔
شاید ابا جان جہاز پر ہماری موجودگی محسوس نہیں کر سکے،
ورنہ اب تک وُہ آ چکے ہوتے۔" محمود نے کہا۔

" میرا بھی یہی خیال ہے۔"

" تو پھر ٹھیک ہے ۔ میں اکیلا اپنا خیال ظاہر کر کے کیا
کروں گا۔" فارُوق نے کندھے اُچکائے۔

" نہیں نہیں ۔ اگر تمہارے ذہن میں اس سے اچھی تجویز
ہے تو ہم اس پر بھی غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

" ہاں ! تجویز تو خیر ہے ۔ چھٹی کے وقت حاضری نہیں
لی گئی ۔ اب ان لوگوں کو کیا معلوم کہ سب لوگ عمارت
تک پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔"

" تو پھر ۔ اس سے کیا ہوتا ہے ۔ ارے بھئی ۔ انہیں گننے
کی ضرورت ہی نہیں ہو گی ۔ فرار کا کوئی راستا ہو گا ہی
نہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"یا پھر۔ ہوگا تو ایسا کہ کوئی اس طرف سے فرار ہونے کے قابل ہی نہ ہو۔"

"دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اس پورے کیمپ کے گرد خار دار تاروں کی دیوار بھی ہے۔ اس دیوار کی وجہ سے انھیں اور بھی اطمینان ہوگا۔"

"سوال تو پھر بھی یہی رہا کہ ہم کیا کریں؟"

"سب لوگوں کے بیدار ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ ہم یہ دو گھنٹے کیوں نہ ان کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے میں گزاریں۔ اس کے بغیر ہماری کامیابی ممکن نہیں۔"

"ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ چلیں۔" فرزانہ نے گویا منظوری دی۔

وہ سینے کے بل لیٹ گئے۔ اور آگے رینگنا شروع کر دیا۔ تیز روشنی سے بچ کر نکلنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، لہٰذا انھوں نے روشنی میں سے گزرنے کا خطرہ مول لیا اور آگے بڑھتے رہے۔ کافی دیر گزر گئی۔ کچھ نہ ہوا، جس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں ابھی تک دیکھا نہیں جا سکا تھا۔

قریباً نصف گھنٹے تک وہ رینگتے رہے۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے سینے چھل گئے ہوں اور ان سے خون رس رہا ہو۔ لیکن وہ تو دھن کے پکے تھے۔ آگے بڑھنا

جو شروع کیا تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ یہاں تک کہ پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئے۔ یہیں سے انھیں سرچ لائٹوں کی روشنی سے نجات ملی، لیکن ابھی وہ اس جگہ سے بہت دور تھے۔ جہاں انھوں نے نگرانوں کو کھڑے دیکھا۔ اب ان کے پاس آگے بڑھنے کے لیے پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ اب انھوں نے رفتار بڑھا دی۔ ابھی تک انھیں خار دار تار کی دیوار نظر نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی۔ یا کتنے فاصلے پر تھی۔

عین اسی وقت انھوں نے ایک عجیب سی آواز سنی۔

سس ، اُف

آواز قدموں کی تھی — کوئی اس سمت میں چلا آرہا تھا، ان کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ جس جگہ پہنچ چکے تھے، وہیں دبک جائیں۔ ساکت ہو جائیں — انھوں نے یہی کیا۔ قدموں کی آواز نزدیک آتی چلی گئی۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے — اچانک ایک آواز اُبھری:

"میں نے تم تینوں کو دیکھ لیا ہے — تم اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

آواز سرد تھی — انھوں نے اپنے جسموں میں کپکپی محسوس کی — اب کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا — انھوں نے دیکھا — ایک بہت قد آور آدمی ہاتھ میں رائفل لیے تنا کھڑا تھا — اس کی تیز نظریں تینوں پر جمی تھیں:

"کیا ارادہ تھا تم لوگوں کا؟"

"فرار کا۔" محمود نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"اس کی سزا جانتے ہو؟"

"ہاں! موت — لیکن یہاں کی زندگی اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔"

"تم نہیں جانتے — موت کس قدر بھیانک ہے۔"

"یہاں کی زندگی اور بھی زیادہ بھیانک ہے۔"

"ہوں — معلوم ہو جائے گا — کتنا عرصہ ہوا ہے یہاں آئے ہوئے؟"

"صرف ایک دن۔"

"اوہو — اتنی جلدی گھبرا گئے۔"

"دراصل ہم آزاد پنچھی ہیں — اور آزاد پنچھی — قید میں رہنے کے عادی ہو ہی نہیں سکتے — وہ سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان تو دے سکتا ہے — قید میں رہنا گوارا نہیں کرتا۔"

"تم لوگوں کو بھی سر ٹکرا ٹکرا کر مرنے کا موقع دیا جائے گا، فکر نہ کرو۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ!" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"اب تم تینوں میرے آگے آگے چلو — سامنے مکان دیکھ رہے ہو پہاڑ کی چوٹی پر، ہمیں وہاں پہنچنا ہے — رات کا بقیہ حصّہ تم وہاں گزارو گے، صبح تم لوگوں کو

باس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اگرچہ سب کو معلوم ہے کہ ان کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس کے باوجود سب بہت غور سے ان کا فیصلہ سنیں گے۔ فیصلے سے پہلے سب کے سامنے اعلان کیا جائے گا کہ رات تین بچوں کو فرار کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"ضرور اعلان کر دیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"تمہارے اعتراض کو یہاں پوچھتا کون ہے۔" اس نے جل کر کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر ہم اپنے تمام اعتراضات محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہاں سے باہر جا کر لوگوں کو سنا دیں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔" اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ابھی تو نہیں چلا۔ کب چل جاتا ہے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"تم لوگ تو شاید میرا دماغ خالی کر دو گے۔ چپ چاپ میرے آگے چلو۔"

"ہاں! اس بات کا امکان ہے۔" فاروق نے فوراً سر ہلایا۔

"کس بات کا۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"اس بات کا کہ آپ کا دماغ ہم بالکل خالی کر دیں۔" فاروق نے کہا۔

"بس! میں نے کہہ دیا۔ اب نہ بولنا۔" وہ غرایا۔

وہ اس کے آگے آگے چلنے لگے۔ اب انہیں رہائشی عمارت سے نکلے پینتالیس منٹ گزر چکے تھے۔ گویا واپس جانے میں بھی پینتالیس منٹ لگتے۔ اور چھ بجنے میں اس طرح صرف نصف گھنٹا باقی بچتا۔ لہٰذا ان کے پاس وقت بہت کم تھا، تینوں اس بات کو صاف محسوس کر رہے تھے۔

اچانک محمود منہ کے بل زور سے گرا۔ اس نے زبردست ٹھوکر کھائی تھی۔ منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکلی تھی۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا؟"

"ٹھوکر لگی ہے۔"

"چلو اٹھاؤ۔ اس کو۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

فاروق اور فرزانہ اس پر جھک گئے اور اٹھانے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب۔" فاروق سیدھے ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا نہیں جناب۔"

"ہم دونوں مل کر بھی اس کو نہیں اٹھا سکتے۔ یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ شاید گرتے وقت سر پر چوٹ آئی ہے۔"

" اوہ - تم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔"

" اب تو پانی کے چھینٹے ہی اسے ہوش میں لا سکتے ہیں - اور ہمارے پاس پانی کہاں۔"

" ہم - میرے پاس ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمر پر لٹکنے والی پلاسٹک کی بوتل اتارنے کے لیے دایاں ہاتھ کمر کی طرف اُٹھایا - یہی وُہ موقع تھا - جس کا انھیں انتظار تھا - ایک ہاتھ سے وُہ رائفل نہیں چلا سکتا تھا - دُوسرا ہاتھ اس کا کمر والی بوتل کی طرف چلا گیا تھا - بس پھر کیا تھا - فارُوق اور فرزانہ نے ایک ساتھ اس پر چھلانگ لگائی اور اس پر جا پڑے - فارُوق اس کی رائفل سے چمٹ گیا - جب کہ فرزانہ سر کے بال پکڑ کر جھول گئی۔

" ارے - ارے - یہ کیا - سس - آں۔" اس کے منہ سے بمشکل نکلا -

" اب سس کریں یا اُف - بے ہوش تو ہونا پڑے گا۔" فارُوق مُسکرایا -

اسی وقت اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی، محمود گرنے کے فوراً بعد چاقو نکال چکا تھا - جب فارُوق اور فرزانہ اس پر گرے - وُہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور چاقو اس کی کمر میں اُتار دیا -

" اب ہمارا یہاں رُکنا انتہائی خطرناک ہو گا۔" اس نے فوراً کہا -

انھوں نے نگران کو جُوں کا تُوں چھوڑا - اس کی رائفل اُٹھائی - اور واپس چل پڑے - اب ان کی رفتار پہلے کی نسبت تیز تھی -

آخر کسی نہ کسی طرح وُہ عمارت تک پہنچ گئے - یہاں حالات جُوں کے تُوں تھے - سب لوگ نیند میں گم تھے - رائفل انھوں نے راستے میں ایک جگہ چھپا دی تھی - تاکہ ضرورت پڑنے پر وہاں سے نکال کر اسے کام میں لایا جا سکے - اس جگہ کو ذہن نشین کر لیا تھا - انھوں نے لیٹنے سے پہلے اپنے جسموں اور کپڑوں کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا - تاکہ کوئی نشان رہ گیا ہو تو اس کو بھی ختم کر دیں -

ابھی انھیں لیٹے صرف پانچ منٹ ہوئے تھے کہ خطرے کا الارم بجنے لگا، اس کی آواز اس قدر کان پھاڑ دینے والی تھی کہ وُہ سب لوگ جو مُردوں سے شرطیں بد کر سوئے تھے - ہڑبڑا کر اُٹھنے لگے اور کیا ہوا کیا ہوا کا شور گونجنے لگا - ایسے میں چند لوگوں نے عمارت سے باہر نکل کر دیکھنے کی کوشش کی - لیکن - باہر چاروں

طرف نگران موجود تھے۔ ان کی رائفلوں کے رُخ عمارت
کی طرف تھے۔ جھانکنے والوں کو دیکھتے ہی وہ غرائے:

"خبردار۔ کوئی باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے، ورنہ گولی
سے اُڑا دیا جائے گا۔"

لوگ سہم کر اندر سمٹ آئے۔ سب کے چہروں
پر خوف دوڑ گیا۔ پھر بلند آواز میں کسی نے کہا:

"ایک نگران کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کی رائفل
بھی غائب ہے۔ تم میں سے یہ کام جس کا بھی ہے۔
وہ باہر نکل آئے۔ ورنہ سب پر مصیبت آئے گی اور اگر
بعد میں اس کے بارے میں پتا چل گیا تو پھر اسے
جو سزا دی جائے گی۔ وہ مدتوں یاد رہے گی۔"

عمارت میں موجود سب لوگ ایک دوسرے کی
طرف دیکھنے لگے۔ جیسے کہ رہے ہوں۔ وہ۔ وہ کون ہے۔
جس نے ایسا کیا ہے۔ کون ہے وہ۔

محمود، فاروق اور فرزانہ ابھی تک اپنی جگہ پر لیٹے ہوئے
تھے جب کہ ان کے ساتھی نو افراد اُٹھ چکے تھے:

"کمال کی نیند ہے ان کی۔ ابھی تک آنکھ نہیں کھلی،
میرا خیال ہے۔ ان کے علاوہ سبھی جاگ چکے ہیں۔"

"اُٹھا دو انھیں بھی۔" شاکر بولا۔

ذاکر نے انھیں ہلانا شروع کیا اور اس طرح باری باری
انھوں نے آنکھیں کھول دیں:

"کیا ہوا۔ کیا چھ بج گئے۔"

"نہیں۔ بجنے ہی والے ہیں۔"

"تب پھر۔ تم نے ہمیں کیوں جگایا۔"

"کسی نے ایک نگران کو قتل کر دیا ہے۔ قاتل کو باہر
نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ یہ کام تم لوگوں کا تو
نہیں ہے۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہ رہے ہیں۔" محمود نے گھبرا کر
کہا۔

اسی وقت وہی آواز پھر گونجی:

"صرف پندرہ منٹ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد عام
تلاشی شروع ہو جائے گی۔ جس کے پاس سے رائفل یا
چاقو برآمد ہو گیا۔ بس وہی قاتل ہے۔"

"ارے باپ رے۔ مم۔ میرے پاس تو کوئی چاقو
نہیں ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں تو پھر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔" ذاکر نے
اسے گھورا۔

"یہ جگہ ہے ہی گھبرانے کے قابل۔" وہ بولا۔

"پتا نہیں ۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔" سیمانے منہ بنا کر کہا ۔

"دراصل یہ کچھ گھبرا گئے ہیں ۔ آپ کچھ خیال نہ کریں۔"

"ارے ہاں ۔ بھئی فرزانہ ۔ ہم تم سے یہ تو پوچھنا ہی بھول گئے ۔ باورچی خانے میں کیا کچھ کرنا پڑا ؟" فاروق بولا ۔

"بس وُہی کام ۔ جو عورتیں کرتی ہیں ۔ پیاز کاٹنا ، لسن چھیلنا ۔ مسالہ بھوننا ۔ روٹیاں پکانا ۔ ہر کام کیا ۔" اس نے کہا ۔

"کیا وہاں کام لینے والا بھی کوئی تھا؟"

"ہاں ! ایک بہت موٹی عورت ۔ وُہ ہم سب کی نگران ہے ۔ وہی سب سے کام لیتی ہے "

"کیا وُہ یہاں کے ذمّے دار لوگوں میں سے ایک ہے۔"

"ارے نہیں ۔ وُہ بھی ہماری طرح قیدی ہے بے چاری، کافی عرصہ پہلے یہاں لائی گئی تھی ۔ اب تو جوان ہو چکی ہے ۔ بلکہ سیاہ بالوں میں کچھ بال سفید بھی نظر آنے لگے ہیں۔"

"اوہ ! تب تو افسوس ہے۔"

"ہاں ! افسوس تو خیر ہونا چاہیے ۔ لیکن کچھ اپنے پر بھی

افسوس کرو۔"

پندرہ منٹ بعد اعلان کیا گیا :

"عمارت کے ہر دروازے سے باری باری باہر نکلنا شروع کرو ۔ ہر دروازے پر چار چار نگران موجود ہیں ، وُہ ہر ایک کی تلاشی لیں گے اور جب عمارت خالی ہو جائے گی، اس وقت عمارت کی بھی اچھی طرح تلاشی لی جائے گی۔"

اس پروگرام پر عمل شروع کیا گیا ۔ محمود اپنے چاقو کے لیے فکر مند تھا ۔ اگرچہ جُوتے کی طرف کسی کا خیال نہیں جا سکتا تھا، پھر بھی نہ جانے کیوں وُہ بے چینی محسوس کر رہا تھا ۔

آخر ان کی باری بھی آئی ۔ اچھی طرح تلاشی لی گئی ۔ محمود کی تلاشی کا مرحلہ بھی گزر گیا ۔ پھر عمارت کی تلاشی لی گئی ، لیکن رائفل نہ ملی ۔ نہ کسی کے پاس سے چاقو ملا ۔ آخر انہیں پتھر توڑنے کے میدان میں لایا گیا ۔ ہر طرف سنسنی کی لہر دوڑی ہوئی تھی ۔ ایسے میں ایک نگران نے چیخ کر کہا :

"باس آ رہے ہیں۔"

سب کی نظریں اس سمت میں اُٹھ گئیں ۔ عربی لباس میں ایک لمبے قد کا شخص لمبے لمبے قدم اُٹھاتا چلا آ رہا

تھا۔ ایک چٹان پر آ کر وہ رُک گیا۔ یہاں سے وہ اپنے قیدیوں اور نگرانوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت لڑکیاں اور عورتیں بھی میدان میں کھڑی تھیں، انھیں بھی باورچی خانے میں نہیں جانے دیا گیا تھا۔

باس کا چہرہ سانولا سا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہاتھ پیر مضبوط نظر آتے تھے۔ چند سیکنڈ تک وہ مجمعے کو دیکھتا رہا۔ پھر گرج دار آواز میں بولا:

"میرے کیمپ میں اور میرے ایک نگران کا قتل۔ یہ کیمپ کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے اور شاید آخری بھی۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ پورا مجمع دم بخود کھڑا تھا۔

"قاتل۔ تم میں سے ایک یا چند ہیں۔ لیکن وہ کون ہے۔ یا کون ہیں۔ یہ تم لوگ نہیں بتا رہے۔ لہٰذا میں سب پر کوڑے برسانے کا حکم دوں گا۔ جو بھی قاتل ہوگا۔ پکار پکار کر کہے گا۔ میں قاتل ہوں۔ میں قاتل ہوں۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جب مجمعے میں سے کوئی کچھ نہ بولا تو اس نے کہا:

"اب تم لوگ دیکھو گے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ آج باورچی خانے میں کھانا نہیں پکے گا۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی آج پتھر توڑیں گی۔ نہ دوپہر کا کھانا ملے گا نہ رات کا۔

جب تک کہ یہ بیان نہ دیا جائے گا کہ کون قاتل ہے۔" باس نے غرّا کر کہا۔

ان سب کے چہروں پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ آخر ایک بڑی عمر کے قیدی نے کہا:

"لیکن جناب۔ اس میں ان کا کیا قصور جنھوں نے نگران کو قتل نہیں کیا۔"

"ہمارا بھی تو کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ شخص تم میں موجود ہے۔ تم ہی اس کی نشان دہی کرو گے۔"

"کاش مجھے معلوم ہوتا۔ میں تو ذرا دیر نہ لگاتا۔" کسی بوڑھے نے کہا۔

"اس طرح جملے بولنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ باس۔ میرا مشورہ ہے۔ آس پاس کی چٹانوں کو بھی دیکھا بھالا جائے۔ ہو سکتا ہے، رائفل وہاں کہیں ہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہم یہ بھی کریں گے، لیکن کھانا آج کسی کو نہیں ملے گا۔"

"اوہ۔ اب کیا کیا جائے۔" محمود بڑبڑایا۔

"ہماری وجہ سے سب لوگ بھوکے رہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہو گی۔"

"اچھا تو پھر میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا

ہوں۔" محمود نے جلدی سے کہا۔
"کیا کہا۔ آپ نے۔ آپ خود کو گرفتاری کے لیے پیش
کریں گے۔" سیما کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔
"ہاں! مجبوری ہے۔" محمود نے کندھے اچکائے۔
"کیا مجبوری ہے۔ مجھے تو یہاں دُور دُور تک کسی مجبوری
کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔"
"بھئی میں چاہتا ہوں۔ سب کو دوپہر کا بھی کھانا ملے
اور رات کا بھی۔" اس نے کہا۔
اور پھر وہ بلند آواز میں بولا:
"باس! یہ کام میرا ہے۔ میں نے ہی اس نگران کو
قتل کیا ہے۔"
"کیا!!!" ان گنت لوگ چلّا اُٹھے۔
"سامنے آکر بات کرو۔ تم کون ہو؟"
محمود مجمعے کو چیر کر آگے بڑھنے لگا۔ سب کی نظریں
اس پر جمی تھیں۔ فاروق اور فرزانہ بھی اس کے پیچھے
آگے بڑھنے لگے۔ لوگ جلدی جلدی انھیں راستا دے رہے
تھے۔ اب جہاں وہ خوف زدہ تھے، وہاں ان کے چہروں
پر اطمینان بھی جھلکنے لگا تھا، کیوں کہ اب دوپہر اور رات
کا کھانا ملنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

آخر محمود، فاروق اور فرزانہ باس کے سامنے جا کھڑے
ہوئے۔
"تو وہ تم ہو۔ جس نے ہمارے ایک نگران کو قتل
کیا ہے۔"
"ہاں بالکل۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔
"ہم بھی اس کے ساتھی ہیں۔" فاروق اور فرزانہ ایک
ساتھ بولے۔
"لیکن کیسے قتل کیا۔ وضاحت کرو۔"
"چاقو سے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔
"چاقو سے۔ لیکن چاقو کہاں ہے۔ ہمیں تو کہیں بھی
کوئی چاقو نہیں ملا۔" باس نے کہا۔
"چاقو اب بھی میرے پاس موجود ہے، لیکن آپ لوگ
اب بھی اسے برآمد نہیں کر سکتے۔"
"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" باس نے فوراً کہا۔
"تو پھر تجربہ کر کے دیکھ لیں۔"
"چلو۔ اس کی پھر تلاشی لو۔" باس نے کہا۔
فوراً ہی دو پتلے دُبلے آدمی محمود کی طرف بڑھے۔
اور اس کی اچھی طرح تلاشی لی، پھر ایک نے کہا:
"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کے پاس چاقو نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کو اُلٹا لٹکا دو۔" باس نے کہا۔

"لیکن اگر میں نے چاقو نکال کر دکھا دیا تو پھر ان دونوں کو اُلٹا لٹکانا چاہیے۔" محمود بولا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ اگر تم چاقو اپنے پاس سے نکال کر دکھا دو تو میں انھیں یہی سزا دوں گا۔"

"یہ کیا مشکل ہے۔ میں ابھی چاقو نکال دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر محمود جھکا اور اس نے اس قدر پھرتی دکھائی کہ کوئی نہ جان سکا کہ چاقو کہاں تھا۔ سب کے سب اس ننھے سے چاقو کو دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔

"حیرت ہے۔ دو آدمیوں نے اس کی تلاشی لی اور چاقو نہیں برآمد کر سکے۔" باس بڑبڑایا۔

"شاید چاقو اس نے کسی خفیہ جگہ رکھا ہوا تھا۔"

"کیوں بھئی۔ کیا بات درست ہے۔"

"جی ہاں جناب۔ یہ تو خیر ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے کارکنوں کو یہ تلاش کر لینا چاہیے تھا۔" محمود نے کہا۔ اس دوران وہ پھر پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چاقو ایڑی میں رکھ چکا تھا۔

"تم لوگ کب سے یہاں ہو؟" باس نے قدرے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"شاید ایک دن سے۔" محمود نے کہا۔

"شاید ایک دن سے کیا مطلب؟"

"شاید اس لیے کہ ہمیں یقین نہیں کہ یہاں کس وقت سے ہیں۔"

"کیوں۔" باس ان تینوں کی طرف گھوم گیا۔ جو انھیں عمارت سے کیمپ تک لائے تھے۔

"ہاں باس۔ یہ کل ہی آئے ہیں۔"

"ہُوں! ان پر قتل کا جُرم ثابت ہو چکا ہے۔ باڑھ کے ساتھ کھڑا کر کے انھیں گولیوں سے اُڑا دیا جائے۔"

"لیکن مسٹر باس! اس سے پہلے ایک کام اور کرنا ہوگا۔" محمود نے کہا۔

"کون سا کام۔" اس نے چونک کر کہا۔

"آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ دونوں چاقو برآمد نہ کر سکے تو انھیں اُلٹا لٹکا دیا جائے گا۔ پہلے آپ انھیں اُلٹا لٹکائیں، اس کے بعد ہمیں باڑھ کے ساتھ کھڑا کر کے گولی ماریں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بات نوٹ کر لیں۔"

"اور وہ کیا۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"یہ کہ اب ہم نے ایک راستا کھول دیا ہے۔ ایک

رائفل بھی غائب کر دی ہے ۔ تمہارے آدمی اس رائفل
کو تلاش نہیں کر سکے ۔ نہ اس راستے کو تلاش کر سکیں
گے جس کے ذریعے ہم نے نگران کو ٹھکانے لگایا ہے،
لہٰذا ہمارے مرنے کے بعد بھی جد و جہد جاری رہے گی،
نگرانوں کا قتل اب ایک عام بات بن جائے گی ۔ اور
ایک دن کیمپ کے قیدی آزاد ہو جائیں گے۔"

"کیا بکواس ہے ۔ کچھ نہیں ہو گا ۔ ہاں رائفل والا
معاملہ ضرور ٹیڑھا ہے ۔ بتاؤ وہ رائفل کہاں ہے؟" باس
نے چیخ کر کہا۔

"افسوس! ہم نہیں بتا سکتے۔" محمود مسکرایا۔

"کیوں؟" باس نے اسے گھورا۔

"ہمیں تو مرنا ہی ہے ۔ گولیوں سے اڑنا ہی ہے ۔
تو ہم کیوں بتائیں ۔ گولیوں سے اڑانے سے زیادہ خوف
تم کس چیز کا دلا سکتے ہو ۔ لہٰذا ہم نہیں بتائیں گے،
اس رائفل کی مدد سے تو نہ جانے کتنے نگران قتل
کیے جائیں گے ۔ کیوں کہ ایک نگران بھی اور قتل ہو گا تو
ایک رائفل اور قیدیوں کے ہاتھ لگے گی ۔ اس طرح
ہر نگران کی موت ایک رائفل بھی قیدیوں کو دلاتی رہے
گی ۔ اس سے زیادہ نفع کا سودا اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہوں ۔ تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ۔ سیفو ۔ یہ
اس مرتبہ زوبی اور زیٹی کن لوگوں کو فروخت کر گئے؟"

"ہم ۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں باس۔"

"ہاں! یہ بات تو ان سے ہی پوچھی جائے گی ۔ آیندہ
وہ جب آئیں ۔ میری ملاقات ان سے ضرور کرانا۔" اس
نے کہا ۔

"او کے باس۔"

"تو تم لوگ اس رائفل کے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟"

"نہیں ۔ ہرگز نہیں۔"

"اچھی بات ہے ۔ جکڑ لو انھیں اور الٹا لٹکا دو ۔ جب تک
یہ رائفل کے بارے میں نہ بتائیں، اس وقت تک لٹکے
رہنے دو۔" باس نے حکم دیا ۔

"اس طرح بھی آخر ہم موت کی آغوش میں ہی جائیں
گے۔"

"نہیں ۔ انھیں مرنے نہ دیا جائے ۔ انھیں خوراک بھی
دیتے رہنا۔" اس نے نگرانوں سے کہا۔

"او کے باس۔" نگران بولے ۔

اور وہ تینوں دل ہی دل میں مسکرا دیے ۔ انھوں نے
کتنی آسانی سے باس کو الجھا دیا تھا ۔ جلد ہی زنجیروں

میں جکڑ کر انھیں تین ستونوں کے ساتھ اُلٹا لٹکا دیا گیا، ان کے ساتھی پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ شاید وُہ سوچ رہے تھے ۔ یہ پہلے تین دلیر یہاں آئے تھے ۔ جنھوں نے ایک نگران کو مَوت کے گھاٹ اُتار دیا تھا ۔

کیمپ میں پتھر توڑنے کا کام شروع کر دیا گیا ۔
اب وُہ ان سب سے کافی فاصلے پر لٹکے ہوئے تھے ۔ کام کرتے ہوئے قیدی انھیں ۔ اور وُہ انھیں دیکھ سکتے تھے ۔

" خود کو پیش کر کے ہم نے ان سب کو بھوکا رہنے سے تو بچا لیا ۔ لیکن اب کیا کریں ۔ اصل کام تو انھیں یہاں سے نجات دلانا ہے ۔ جہاز میں ہم نے اسی لیے زوبی اور زیٹی پر حملہ نہیں کیا تھا کہ ہم دیکھنا چاہتے تھے ، چکر کیا ہے ۔" محمود جلدی جلدی بولا ۔

" ہمیں کسی نہ کسی طرح خود کو ان زنجیروں سے نجات دلانا ہو گی ۔ باس اور نگرانوں سے بہر حال غلطی ہو چکی ہے ۔ انھوں نے تمھارے چاقو کو کوئی اہمیت نہیں دی ۔ وُہ اب بھی تمھاری ایڑی میں موجود ہے ۔ لٰہذا چاقو ایڑی میں سے نکال لو ۔" فاروق نے کہا ۔

" دماغ تو نہیں اُلٹ گیا ۔" فرزانہ نے جل کر کہا ۔

" ہاں ۔ ہے تو اُلٹا ہوا ہی ۔" فاروق مسکرایا ۔

" مطلب یہ کہ آخر مَیں اپنے ہاتھ جوتے کی ایڑی تک کس طرح لے جاؤں ۔"

" کوشش کرو کوشش ۔" فرزانہ نے کہا ۔

" انھوں نے جکڑا اس طرح ہے کہ ہاتھ اُوپر کی طرف جا ہی نہیں سکتے ۔"

" تب پھر صبر کرو ۔"

" صبر کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم زندگی کے لیے کوشش ہی نہ کریں ۔ ہم کوشش کریں گے ۔ اور فرزانہ کے دماغ کی مدد سے کریں گے ۔"

" تمھارا مطلب ہے ۔ مَیں ترکیب بتاؤں ۔" فرزانہ نے کہا ۔

" نہیں ۔ بتانے سے پہلے ترکیب سوچ لو ۔ بغیر سوچے تم بتا کس طرح سکو گی ۔"

" ہاں ! یہ بھی ٹھیک ہے ۔ خیر ۔ مَیں سوچ چکی ہوں ۔"

" ہائیں ۔ سوچ بھی چکی ہو ۔ تمھارا دماغ ہے یا ۔"

" بس بس ۔ میرے دماغ کا مقابلہ کسی دُنیاوی چیز سے نہ کرنا ۔ دُنیاوی چیزیں دماغ کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتیں ۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا ۔

"خیر — ترکیب بتاؤ۔"

"ترکیب اس قدر سیدھی اور آسان ہے کہ بس کیا بتاؤں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"بتانی چاہیے بھی نہیں — کہیں ہم اس پر عمل پیرا نہ ہو جائیں۔" فاروق نے تلملا کر کہا۔

"جلے بھنے کیوں جا رہے ہو — لو سنو۔"

اس کی آواز نیچی ہو گئی — محمود اور فاروق حیران سے رہ گئے — ترکیب بہت ہی سادہ اور آسان تھی — وہ آسانی سے چاقو حاصل کر سکتے تھے — بس انھیں انتظار کرنا پڑتا تھا اور وہ کر ہی کیا سکتے تھے — آخر دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوا —

دو آدمی انھیں بھی کھانا دینے کے لیے آئے —

"کیا کھانا کھانے کے لیے ہمیں کھولا جائے گا؟"

"نہیں — اسی حالت میں کھانا کھانے کا حکم ہے۔" ایک نے کہا —

"بھلا اس طرح کیسے کھایا جا سکتا ہے۔"

"آپ کی مرضی — کھانا ہے تو کھا لیں — ہم تو بس اتنی مدد کر سکتے ہیں کہ لقمے توڑ کر تم لوگوں کے منہ میں دے دیں۔"

"آپ بھی قیدی ہی لگتے ہیں۔"

"ہاں!" انھوں نے سرد آہ بھری۔

"خیر — ہمیں اپنے قیدی بھائیوں سے تو نہیں لڑنا جھگڑنا چاہیے، لیکن ایک مہربانی آپ کو بھی کرنا ہوگی۔" محمود بولا۔

"زنجیریں تو ہم کھول نہیں سکیں گے۔" ایک نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں! ایسا کرنے کے لیے ہم کہ بھی نہیں رہے، لیکن ہمارے جوتے ضرور اتار دیں، کیوں کہ کھانا کھاتے وقت ہم جوتے پہنے نہیں رہتے۔"

"ضرور ضرور — یہ کیا مشکل کام ہے۔" ایک قیدی بولا — اور دوسرے نے ان کے جوتے اتار کر نیچے رکھ دیے —

اب انھوں نے چند لقمے کھانے میں بہتری سمجھی، کیوں کہ بھوکے پیاسے حالات کا مقابلہ بھی تو نہیں کیا جا سکتا — پانی بھی پیا — اس طرح کھانے اور پینے کا ان کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا —

آخر کھانا کھلانے والے رخصت ہو گئے — محمود کے جوتے اب اس کے ہاتھوں کے عین نیچے پڑے تھے اور وہ تھوڑا سا زور لگا کر چاقو حاصل کر سکتا تھا، لیکن دن کی روشنی میں زنجیروں سے آزاد ہو کر وہ کچھ فائدہ نہیں

اُٹھا سکتے تھے۔ لہٰذا انھیں رات تک اسی طرح لٹکنا پڑا۔ شام کا کھانا بھی اسی طرح کھایا گیا۔ آخر سب لوگ جا کر لیٹ گئے۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ ہُوا کی سائیں سائیں کے سوا اب کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر اس جگہ سرچ لائٹیں گردش کرنے لگیں۔ لائٹیں ان کے جسموں پر بھی پڑتیں اور گزر جاتیں۔ انھوں نے حساب لگایا۔ دو منٹ کے لیے وُہ اندھیرے میں رہتے تھے۔

"ہمارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ دو منٹ کے اندر اندر ہمیں زنجیروں سے آزاد ہونا ہو گا۔"

"پہلے تم اپنی زنجیر کاٹو۔ اس حد تک کہ ہم لٹکے ہوئے ہی نظر آئیں۔ اس حد تک ہماری بھی زنجیریں کاٹ ڈالو۔ اگلے دو منٹ میں دُوسری قسط کاٹ دی جائے گی۔" فرزانہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہی کرنا ہو گا۔"

جُوں ہی وُہ اندھیرے میں نہائے۔ محمود نے جُوتا اُٹھایا اور اس کی ایڑی میں سے چاقو نکال لیا۔ اس نے اپنے جسم کے گرد کسی ہوئی زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ پھر ہاتھ بڑھا کر فاروق کو چاقو دے دیا:

"اپنی زنجیریں تم خود کاٹو۔ کہیں اندھیرے میں چاقو جسم میں نہ لگ جائے۔"

فاروق نے چاقو لے لیا اور زنجیریں کاٹ ڈالیں، اسی طرح فرزانہ نے کیا۔ اب صرف ان کے پاؤں زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔

"اوہو۔ یہ تو ہم بھول ہی گئے۔ پیروں تک ہاتھ کس طرح لے کر جائیں۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"بھئی آخر جمناسٹک کے ماہر ہو۔ جسم کو دوہرا نہیں کر سکتے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"اوہ ہاں۔ دوہرا تو واقعی کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر کرو۔" فاروق بولا۔

"اندھیرا تو ہونے دو۔"

اندھیرا ہوتے ہی۔ محمود دوہرا ہو گیا اور پہلے ایک پاؤں کی زنجیر کاٹ دی۔ زنجیر کٹتے ہی ایک جھٹکے سے اس کا پاؤں فضا میں جھولنے لگا۔

"اب جُوں ہی مَیں دُوسرے پاؤں کی زنجیر کاٹوں گا۔ دھڑام سے نیچے گروں گا۔"

"گرنا ہی پڑے گا۔ اور کوئی صُورت نہیں۔"

"کیوں نہ دو منٹ اور انتظار کر لیا جائے، کیونکہ وقت

کم رہ گیا ہے۔ اور مجھے گرنے کے بعد سنبھلنا بھی ہوگا۔" محمود بولا۔

"ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ دو منٹ اور سہی۔"

جلد ہی وہ روشنی میں نہا گئے۔ اور دو منٹ تک نہائے رہے۔ پھر تاریکی کی پلیٹ میں آ گئے۔ محمود فوراً دوہرا ہوا اور دوسرے پیر کی زنجیر کاٹ دی۔ وہ زور سے گرا۔ لیکن چونکہ دوہرا تھا۔ اس لیے سر بچ گیا۔ اب محمود نے فرزانہ اور فاروق کو بھی آزاد کیا۔

"جوں ہی روشنی ہو گی۔ دیکھ لیا جائے گا کہ ہم زنجیروں کے ساتھ لٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ لہٰذا نگران اس طرف دوڑ پڑیں گے، وہ ہم پر اندھا دھند فائرنگ بھی کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ جانتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی رائفل نہیں ہے۔ اور ہے تو کہیں چھپی ہوئی ہے۔ لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جلد از جلد اس رائفل تک پہنچ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور انھوں نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ اب رینگنے کا وقت نہیں تھا۔ ان کے دوڑتے قدموں کی گونج نے مکمل خاموشی میں ایک ہل چل مچا دی۔ نگران چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ لیکن اندھیرے میں کیا نظر آ سکتا تھا۔ ہاں جس طرف سرچ لائٹ کی روشنی جا رہی تھی۔ اس

طرف ضرور وہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن وہ صرف اندھیرے میں سفر کر رہے تھے۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ۔ یہ اندازہ وہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔ کہ رائفل کہاں ہے۔ انھوں نے ایک نشانی دیکھ لی تھی — اس نشانی تک انھیں پہنچنا تھا، پھر رائفل ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ اور پھر وہ ایسی جگہ پہنچ گئے، جہاں سے انھیں اندھیرے کا ساتھ چھوڑنا پڑا اور روشنی میں نہانا پڑا۔

قدموں کی آوازوں نے نگرانوں کو پہلے ہی چوکنا کر دیا تھا۔ لہٰذا انھیں فوراً ہی دیکھ لیا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ گولیوں کی ایک باڑھ ماری گئی۔ پہاڑیاں ان کی آوازوں سے گونج اٹھیں۔ لیکن وہ تو روشنی میں آتے ہی لڑھک گئے تھے۔ گولیاں کیا ان کے جسموں کو چاٹتیں۔ ان کا تیزی سے لڑھکنا جاری رہا۔ گولیاں برستی رہیں۔ ساتھ میں نگران ان کی طرف دوڑ رہے تھے۔

انھوں نے لڑھکنے کی رفتار تیز کر دی۔

"ایسا نہ ہو کہ رائفل تک پہنچنے سے پہلے یہ لوگ ہم تک پہنچ جائیں۔" فرزانہ بولی۔

"اگر ایسا ہوا تو پھر ہم پتھروں سے کام لیں گے۔" فاروق نے کہا۔

اور لڑھکتے لڑھکتے انھوں نے ایک ایک پتھر بھی ہاتھ میں لے لیا۔ پھر دُوسرے ہاتھ میں بھی پتھر لے لیے۔ اچانک وہ اندھیرے میں نہا گئے۔ اب وہ اُٹھے اور جھکے جھکے اس نشانی کی طرف دوڑے۔ نگران اندھیرے میں بھی گولیاں برسا رہے تھے۔

آخر کار وہ رائفل تک پہنچ گئے۔ ادھر رائفل محمود کے ہاتھ میں آئی۔ ادھر وہ روشنی میں آ گئے۔ اب وہ سینے کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ اور نگران لمحہ بہ لمحہ ان سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔

سائرن

یہ آوازیں ایسی نہیں تھیں کہ عمارت میں سونے والے سوئے ہی رہتے۔ وہ جاگ گئے اور باہر نکل نکل کر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ کیا معاملہ ہے۔ گولیوں کا تبادلہ کن لوگوں کے درمیان ہو رہا ہے۔ ایسے میں ان کی نظریں اس جگہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ جہاں ان تینوں کو اُلٹا لٹکایا گیا تھا۔

"ارے۔ وہ لوگ وہاں لٹکے نظر نہیں آ رہے۔" کسی نے چلّا کر کہا۔

"تب پھر یہ وُہی ہیں۔ ان سے ہی جھڑپ ہو رہی ہے، ضرور وُہ کسی طرح ان زنجیروں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔" ایک اور بولا۔

"کمال کے ہیں یہ تینوں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے، کیا خبر۔ وُہ ہمیں یہاں سے نجات دلانے میں کامیاب ہو

جائیں۔"

"نہ ہوئے تو ساتھ دینے کے جرم میں ہمیں بھی موت کی سزا پانا ہوگی۔" ایک اور بولا۔

"یہ تو ہے۔ خطرہ تو مول لینا ہوگا۔"

سب کے سب دروازوں سے لگ کر رہ گئے۔ برستی گولیوں میں آگے بڑھنے کی ہمت کس میں تھی۔ اسی وقت انھوں نے فائرنگ کی آوازیں سُنیں۔ وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ سینے کے بل لیٹے نگرانوں کو اپنی طرف آتے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے تحاشہ دوڑ رہے تھے۔ ابھی تک انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب رائفل حاصل کر چکے ہیں، ورنہ وہ بے خطر آگے نہ بڑھتے۔ پھر جوں ہی وہ ان کی زد میں آئے۔ محمود نے تاک تاک کر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ اوپر تلے گرے۔ ان کی چیخوں نے فضا کو تھرّا دیا۔

ادھر محمود ان کے گرتے ہی ان کی طرف دوڑا۔

"یہ کیا کر رہے ہو محمود۔ ہمیں عمارت کی طرف دوڑنا چاہیے۔"

محمود نے کوئی جواب نہ دیا۔ تیر کی طرح آگے نکلتا چلا گیا۔

"محمود ٹھیک کر رہا ہے۔ فاروق۔ چپ رہو۔"

"کیا ٹھیک کر رہا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"وہ ہمارے لیے رائفلیں اٹھانے گیا ہے۔ مرنے والوں کی رائفلیں۔ بھگوڑوں کی رائفلیں۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

محمود واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں سات رائفلیں تھیں۔ اور میگزین کی کئی پیٹیاں اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔

"ویری گڈ۔ یہ ہوا ہے کام۔" فاروق چلّایا۔

"تم تو اسے روک رہے تھے۔" فرزانہ بولی۔

"میری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔"

اب وہ عمارت کی طرف دوڑے۔ عمارت کے دروازوں سے قیدیوں کو جھانکتے دیکھ کر وہ مسکرائے، محمود نے بلند آواز میں کہا:

"ساتھیو! ہم تمہارے لیے آزادی کا پیغام لائے ہیں، بشرطیکہ تم لوگ ہمت کرو اور ہمارا ساتھ دو۔ ہمارے پاس اس وقت سات رائفلیں ہیں۔ لیکن ہمارا اصلی اسلحہ اردگرد بکھرے ہوئے پتھر ہیں۔ ان پتھروں کا ذخیرہ عمارت کے اندر جمع کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کم از کم چار

پتھر اُٹھا کر عمارت کی چھت پر پہنچائے گا۔ ہم نے نگرانوں کو مار بھگایا ہے۔ بڑا حملہ ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ کیوں کہ صورتِ حال ان کی امیدوں کے بالکل اُلٹ ہے۔ چنانچہ۔ اس وقت سے ہمیں فائدہ اٹھانا ہے، شاباش دوستو۔ ہر آدمی کم از کم چار پتھر عمارت کی چھت پر پہنچا دے۔"

محمود کی آواز میں گونج تھی۔ تڑپ تھی۔ سچا جذبہ تھا۔ وہ بھیڑوں کی طرح دروازوں سے نکلنے لگے اور پتھر لے کر لوٹنے لگے۔

تینوں نے فوراً چھت کا رُخ کیا اور مورچے سنبھال لیے۔ ان کے ساتھی پتھر چھت پر ڈھیر کرنے لگے۔ اب وہ سب بھی اوپر آ چکے تھے اور عمارت کی چھت پر منڈیر کے ساتھ ساتھ سینے کے بل لیٹ گئے تھے۔ پتھر ان کے ساتھ ساتھ رکھے تھے۔ گویا وہ پتھروں سے حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

"ابھی تک حملہ نہیں ہوا۔ کمال ہے۔"

"وہ جان چکے ہیں۔ مقابلہ اتنا آسان نہیں رہا۔ پوری تیاری کر کے آئیں گے۔" محمود نے کہا۔

محمود کا خیال ٹھیک نکلا۔ جلد ہی سرچ لائٹوں کو صرف

عمارت پر سیٹ کر دیا گیا۔ اب پوری عمارت روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اور نگرانوں کا مسلح دستہ عمارت کی طرف باقاعدہ پوزیشن لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر محمود نے بلند آواز میں کہا:

"ساتھیو! تم لوگ آزادی حاصل کرنا چاہتے ہو یا ساری زندگی یہیں گلنا سڑنا پسند ہے۔"

"آزادی۔ اس لیے کہ آزادی سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"تو پھر اس کے لیے صرف ایک شرط ہے۔ تم لوگ ہماری وہ شرط مان لو۔ ان شاء اللہ آزادی تمھیں ہم دلائیں گے۔"

"اور وہ شرط کیا ہے؟"

"شرط صرف یہ ہے کہ تم لوگوں کو ہماری ہدایات پر عمل کرنا ہو گا۔ جو ہم کہیں۔ صرف وہ کرنا ہو گا۔ اپنی عقل سے تم لوگ کچھ نہیں کرو گے۔ اگر ہماری ہدایات حالات اور موقعے کے مطابق نظر نہ آئیں، تب بھی صرف ہدایات پر ہی عمل کرنا ہو گا۔ ورنہ ہم ان لوگوں پر فتح نہیں پا سکیں گے۔"

"یہ کیا مشکل شرط ہے۔" کسی نے کہا۔

"بہت مشکل شرط ہے۔" محمود بولا۔

"خیر۔ دیکھا جائے گا۔ ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

رائفلوں والے مناسب فاصلے پر آکر رُک گئے، پھر باس کی آواز سپیکر سے اُبھری:

"تم لوگوں نے بغاوت کر کے اچھا نہیں کیا۔ یہاں سے بچ نکلنے کے قطعاً کوئی امکانات نہیں ہیں، ہماری طاقت بہت زیادہ ہے۔ ہم بہت تجربہ کار ہیں۔ تم سب بالکل اناڑی ہو۔ تمہارا یہ منصوبہ بالکل ناکام ہو جائے گا۔ لہٰذا میری بات مان لو۔ ہتھیار پھینک دو۔ کسی کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ کسی کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن یہ صرف اس وقت تک کی بات ہے، نہ ماننے کی صورت میں جب ہم تم لوگوں کو قابو کر لیں گے، پھر جو انجام ہوگا۔ وُہ اس کیمپ کی فضا ہمیشہ یاد رکھے گی۔"

باس کے الفاظ حد درجے خوف ناک تھے اور قیدیوں پر خوب اثر انداز ہوئے تھے۔ یہ بات محسوس کرتے ہی محمود نے بلند اور گونج دار آواز میں کہا:

"تمہارا خیال بالکل غلط ہے مسٹر باس۔ ہم تمہارے

ساتھیوں کو اس وقت تک دو مرتبہ شکست دے چکے ہیں۔ تمہارے کئی آدمیوں کو مَوت کے گھاٹ اُتار چکے ہیں، جبکہ ہم میں سے کوئی زخمی تک نہیں ہوا۔ اور آیندہ چند منٹ میں معلوم ہو جائے گا۔ پلّہ کس کا بھاری رہتا ہے۔ یہ عمارت اب ہمارا قلعہ ہے۔ ہم مر تو سکتے ہیں۔ اب تمہاری غلامی میں زندگی بسر نہیں کر سکتے۔"

"تمہاری مرضی۔ اب مَیں تم لوگوں کو وُہ سزا دوں گا کہ کیا کسی نے کسی کو دی ہو گی۔"

"ہم نے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔"

نگران ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔

"کیا ہم ان پر حملہ کریں جناب؟" کسی نے پُوچھا۔

"ابھی نہیں — جب تک میں اشارہ نہ دوں۔ کوئی حملہ نہ کرے۔ فارُوق، فرزانہ۔ تم ان میں سے پانچ کو جلدی سے رائفل چلانا سکھا دو۔"

"م۔ میں رائفل چلانا جانتا ہوں۔" ایک آواز آئی۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ اگر کوئی اور صاحب رائفل چلانا جانتے ہوں۔ وُہ بھی آگے آ جائیں۔"

چھے سات نوجوان آگے آ گئے۔ وُہ حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ ادھر نگران چاروں طرف سے بڑھ رہے تھے،

یہاں تک کہ وہ عمارت کے بہت نزدیک آ گئے۔ ان کے
ساتھی بے چینی محسوس کرنے لگے۔

"آخر ہمیں کب حملے کا حکم ملے گا؟"

"خاموش! بے چین ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ
شرط مان چکے ہیں۔" محمود غرّایا۔

اور وہ سہم کر رہ گئے۔ آخر نگران بہت نزدیک آ
گئے۔ اب انھوں نے چاروں طرف سے گولیاں برسانا شروع
کر دیں۔ وہ سر جھکائے۔ دبکے رہے۔

"اسی طرح دبکے رہو۔ ابھی کوئی حملہ نہیں کرے گا۔"
محمود نے بلند آواز میں ہدایات دیں۔

وہ دبکے رہے، پھر جوں ہی گولیوں کا زور کم ہوا اور
نگران اور آگے بڑھے۔ اتنا آگے کہ ان کے پتھروں کی زد
میں آسانی سے آ سکتے تھے۔ محمود نے کہا:

"حملہ!"

ایک ساتھ رائفلیں گنگنائیں۔ پتھر برسے۔ اور خوب برسے،
نیچے بے شمار چیخیں گونجیں اور نگرانوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

"بھگوڑو۔ بزدلو۔ کہاں جا رہے ہو۔" باس نے گرج دار
آواز میں کہا۔

"پتھروں کی بارش جاری رہے۔" محمود نے کہا۔

"رائفلوں سے فائرنگ بھی۔ بھاگتے دشمن زیادہ مار کھاتے
ہیں۔" فرزانہ بولی۔

انھوں نے تاک تاک کر فائر کیے۔ ادھر بھگدڑ میں اور
اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ بہت دور پہنچ گئے۔

"اب یہ پھر تیاری کر کے آگے بڑھیں گے۔ لہٰذا ہمیں
بھی اس مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایک منٹ کے لیے
عمارت کے دروازے کھول دیے جائیں۔ باہر بکھری ہوئی
رائفلیں اور پتھر اٹھا کر اندر لے آئیں۔ لیکن ایک منٹ
سے زیادہ دیر ہرگز نہ لگے۔ رائفل بردار لوگ عمارت
کی چھت پر موجود رہیں گے۔ تاکہ دشمن عمارت کی طرف بڑھنے
کی کوشش کرے تو اس کی پیش قدمی روک دی جائے۔"

اس ہدایت پر عمل کیا گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر
سے مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ ادھر نگران اس
مرتبہ پہلے کی نسبت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے،
اب وہ اندھا دھند عمارت کی طرف نہیں آ رہے تھے۔
مناسب فاصلے پر پہنچ کر وہ رک گئے اور اِکّا دُکّا فائرنگ
کرنے لگے۔ انھوں نے بھی اسی انداز میں فائرنگ اور
پتھرنگ شروع کی۔ لیکن اس طرح دونوں فریقوں میں سے
کسی کا بھی کوئی نقصان نہ ہوا:

"یہ کیا۔ اس جنگ کا کیا فائدہ۔" فاروق بولا۔

"ضرور کوئی بات ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کیا بات ہے؟" محمود نے کہا۔

"یہ کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اور اس کے لیے انھیں مہلت کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انھوں نے سوچا کہ عمارت کے چاروں طرف پھیل جائیں۔ اور اتنے فاصلے پر مورچے بنا لیں۔ جہاں سے ہم انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اور اس دوران وہ اپنی تیاری کر لیں۔"

"اب نہ جانے ان کی تیاری کس قسم کی ہو گی۔" فاروق بولا۔

"اس قسم کی کہ ہماری زد میں آئے بغیر ہمیں نشانے پر لے سکیں۔ یا تو وہ زیادہ طاقت کی رائفلوں کا انتظام کریں گے۔ یا پھر بم وغیرہ استعمال کریں گے۔"

"ارے باپ رے۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"لیکن ہمیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، صرف یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ اب ہم لوگوں کو معاف تو کریں گے نہیں۔ اگر ہم ان کے قابو میں آ گئے تو یہ ہمیں ضرور مار ڈالیں گے، تو کیوں نہ آزادی کے لیے کوشش کرتے ہوئے جان دیں۔"

"آپ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" کئی نوجوان ایک ساتھ چلائے۔

اکا دکا فائرنگ ہوتی رہی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے نگرانوں کو انھیں قابو میں کرنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔

اور پھر ایک گھنٹے بعد انھوں نے عمارت کے چاروں طرف کچھ لوگوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ ان کے پاس دوربینیں تو تھیں نہیں کہ دور سے دیکھ کر اندازہ لگا سکتے — لہٰذا وہ نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ اب نگران بھی مڑ مڑ کر آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ نزدیک آتے چلے گئے۔

"یہ۔ یہ۔ یہ لوگ تو فوجی لباس میں ہیں۔" فرزانہ چونک اٹھی۔

"فوجی لباس۔ لیکن کس ملک کے فوجی لباس میں؟" فاروق نے کہا۔

"شش۔ شاید۔ اس جزیرے کی حکومت کے فوجی لباس میں۔"

"لیکن جزیرے کی حکومت کا اس کیمپ سے کیا تعلق، یہ کیمپ ان کا قائم کردہ تو ہے نہیں۔"

"واقعی عجیب بات ہے۔"

ان کے درمیان اب خوف کی لہر دوڑ گئی۔ فوجی

دستہ لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہا تھا۔ ان کے ساتھ ہلکی توپیں بھی تھیں۔ توپوں کو دیکھ کر ان کے رہے سہے اوسان اڑ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کمزور فوج کے مقابلے میں توپیں لا کھڑی کی جائیں گی۔

اور اس کا دُوسرا خوف ناک مطلب یہ تھا کہ کیمپ کے باس کا اس جزیرے کی حکومت سے براہِ راست تعلق تھا۔ اگر تعلق نہ ہوتا تو اس قدر جلد یہ انتظامات کس طرح ہو سکتے تھے۔

توپیں مناسب فاصلے پر آ کر رُک گئیں، پھر سپیکر پر آواز گونجی:

"اس وقت تک تم لوگ خوب پُر لطف انداز میں مقابلہ کرتے رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تم لوگ قلعہ بند ہو گئے تھے۔ لیکن اب ہم اس قلعے کو توڑنے کا انتظام کر کے آئے ہیں۔ جب اس قلعے پر گولے برسیں گے۔ تو پھر تم لوگ بھی قلعے کے ساتھ بھسم ہو جاؤ گے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ سوچ لو۔ غور کر لو۔ جب ہم نے گولہ باری شروع کی، پھر نہیں رُکیں گے۔ ہم تم لوگوں کو سوچنے کے لیے صرف ایک

منٹ دیتے ہیں۔"

ان کی نظریں گھڑیوں پر جم گئیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ سب کی نظریں ان پر جمی تھیں۔ آخر محمود نے بلند آواز میں کہا:

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کیمپ کے باس کا ساتھ اس جزیرے کی حکومت کیوں دے رہی ہے؟"

"یہ سوال بحث سے خارج ہے۔" باس کی آواز اُبھری۔

"کیا یہ کیمپ یہاں کی حکومت کی منظوری سے چل رہا ہے؟" فرزانہ نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"اس سوال پر بھی بات نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا خیر۔ ایک توپ کا گولہ عمارت سے چند میٹر دُور گرا کر دکھایا جائے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نقلی توپیں لے آئی گئی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ یہ بھی سہی۔"

دُوسری طرف سے کہا گیا۔ پھر ایک توپ داغی گئی۔ گولے کی آواز گونجی۔ عمارت کے سامنے گرد کا ایک بادل اڑا۔ اور جب بادل چھٹا تو وہاں انھیں بہت گہرا گڑھا نظر آیا۔ وُہ کانپ گئے۔ اگر یہ گولہ عمارت پر لگا ہوتا تو اس کی دیوار اڑ چکی ہوتی۔

"اب کیا کہتے ہو؟"

"اگر اس ریاست کی فوج بھی کیمپ بنانے والوں کے ساتھ ہے تو ہم غریب کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھی تو ایک کمزور قلعے میں بند ہیں۔ جو توپوں کے ایک دو گولے بھی مشکل سے برداشت کرے گا۔"

"تو پھر ہتھیار نیچے پھینک دیں اور عمارت کے دروازے کھول کر ہاتھ اوپر اُٹھائے ہوئے باہر نکل آئیں۔" باس نے کہا۔

"ہاں! اب یہی کرنا ہوگا۔" محمود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ دُور دُور تک اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر فارُوق اور فرزانہ کی طرف دیکھا:

"ہم تمھاری آنکھوں میں مایوسی کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"کم از کم ایک کام ہم ضرور کر سکتے ہیں۔" فارُوق نے کہا۔

"اوہ۔ اور وُہ کیا؟" کئی آوازیں اُبھریں۔

"یہ کہ مایوس نہ ہوں۔ اللہ سے اُمید رکھیں اور دُعا کریں۔"

"ہاں واقعی۔ یہ تو ہمارے اختیار میں ہے۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"تو پھر۔" محمود کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت ایک سائرن کی آواز گونج اُٹھی تھی۔

ماہانہ

سائرن کی آواز نے انھیں کم چونکایا۔ باہر کھڑی فوج
کو زیادہ۔ انھوں نے فوج میں سراسیمگی دوڑتے دیکھی۔
اور پھر وہ تیزی سے مڑے۔ دوسرے ہی لمحے وہ سر
پر پیر رکھ کر بھاگے جا رہے تھے۔

"یہ۔ یہ انھیں کیا ہو گیا۔"

"اللہ تعالیٰ نے مدد بھیج دی۔ اس مدد نے ان لوگوں
کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔" فرزانہ مسکرائی۔

"لیکن یہ سائرن کیسا ہے۔ ابھی تک جاری ہے۔"

"یہ ضرور ان لوگوں کے لیے کوئی خاص اشارہ ہے۔"

"ہمیں کس طرح معلوم ہو۔"

"باس تو بتا ہی سکتا ہے۔"

"ارے ہاں۔ باہر نکل کر باس اور اس کے ساتھیوں
پر ٹوٹ پڑو۔ موقع اچھا ہے۔ یہ لوگ پہلے ہی

پریشان کھڑے ہیں۔ ان کی پریشانی سے فائدہ اٹھانا
چاہیے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

اور وہ نیچے کی طرف دوڑ پڑے۔ عمارت کے
سب دروازے کھل گئے۔ ادھر باس کے ساتھی ہکا بکا
کھڑے تھے۔ باس بھی ان کے درمیان میں موجود تھا۔
ان سب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر
پھول گئے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں دو دو پتھر تھے۔ اور
پھر انھوں نے پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ باس
اور اس کے ساتھیوں پر اتنے پتھر برسے کہ وہ گرتے
چلے گئے۔ ان میں سے ایک بھی اپنے پیروں پر کھڑا
نہ رہ سکا۔

ایک منٹ پہلے جو فتح یاب تھے۔ اب اپنے ہی خون
میں نہا گئے تھے۔ قدرت کی طرف سے یہ عجیب کایا پلٹ
ہوئی تھی۔

محمود باس تک پہنچ گیا۔ اس نے سر کے بالوں سے
اسے پکڑا اور سیدھا کرتے ہوئے بولا:

"اب کیا حال ہے مسٹر باس۔"

"م۔ میں۔ میں۔" وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"یہ سائرن کی آواز کیسی ہے؟"

"جزیرے پر کسی مُلک نے حملہ کر دیا ہے۔ فوج ساحل پر گئی ہے۔ تاکہ حملے کو روک سکے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"معلوم نہیں جزیرے کی فوج کو فتح ہوتی ہے یا شکست، کیوں نہ ہم اس سے پہلے ہی ان سب کو ختم کر دیں۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں! خدا نخواستہ اگر ان کو فتح ہو گئی تو یہ فتح باس اور ان لوگوں کی بھی فتح ہو گی۔ اس لیے انہیں ختم کر دینا ہمارے حق میں بہتر ہے۔ اس صورت میں ہم کسی نہ کسی طرف سے نکلنے کی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔ لیکن میں چند سوال مسٹر باس سے کرنا پسند کروں گا۔ مسٹر باس۔ کیا تمھارا تعلق اس جزیرے کی حکومت سے ہے۔"

"جزیرے کی حکومت کو میری وجہ سے سالانہ معقول آمدنی ہوتی ہے۔ ان پہاڑوں کا ٹھیکا میں نے لے رکھا ہے۔ ان لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ کہ ہم پتھر کن لوگوں سے تڑواتے ہیں یا پتھر تڑوانے کے لیے مزدور کہاں سے لاتے ہیں۔ ان کی تو بس ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ مزدور ان کے جزیرے کے نہیں ہونے

چاہییں۔ لہٰذا یہ ہر طرح ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اشارے پر فوج نے اس عمارت کو گھیر لیا تھا۔"

"تو یہ سب لوگ ہمارے مُلک کے ہیں؟"

"نہیں۔ ارد گرد کے کچھ اور مُلکوں کے بھی ہیں۔ آج کل یہ تجارت زوروں پر ہے۔" اس نے کہا۔

"تجارت۔ کیا مطلب؟"

"انسانوں کی تجارت۔ بچّوں کی تجارت۔ ہم لوگ دراصل اغوا کرنے والوں سے ان کو خرید لیتے ہیں۔ اغوا کرنے والے جانتے ہیں کہ ان بچّوں کے اچھے پیسے کہاں مل سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ بچّوں کو وہیں لے جاتے ہیں۔ بحری جہازوں کے ذریعے یہ تجارت اور بھی آسانی سے ہوتی ہے۔"

"افسوس۔ تم لوگ کس قدر ظالم ہو۔ اغوا کرنے والے تم سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ جو چند ہزار روپے کے لیے ماؤں کی گود اجاڑ دیتے ہیں۔ انہیں اور ان معصوم بچّوں کو زندگی بھر کے لیے ایک عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کاش ایسے لوگوں کے بچے بھی اغوا کر لیے جائیں۔ مگر نہیں۔ ہم تو یہ بد دعا بھی نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان بچّوں کا تو کوئی قصور نہیں،

قصور تو صرف ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ میرے بس میں
اگر ہوتا۔ تو ان سب کا ایک بیگار کیمپ بناتا۔ اور
اس کیمپ میں ان سے اسی طرح صبح سے شام تک پتھر
تڑوائے جاتے۔ لیکن افسوس یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"
محمود کی آواز جذبات کے بوجھ سے بھرّا گئی۔ اسی
وقت انھوں نے توپوں کی گولہ باری کی پُر زور آوازیں
سُنیں۔ شاید ساحل پر جنگ چھڑ گئی تھی۔

★

" ادھر جنگ شروع ہو گئی ہے۔ کیا خیال ہے۔
ان لوگوں کو پتھر مار مار کر ہلاک کردینا کیسا رہے گا۔"
" یہ سزا ان کے لیے بہت ہلکی ہوگی۔ لیکن اس
کے علاوہ اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ سب لوگ ثواب کے
اس کام میں حصّہ لیں۔" فارُوق نے کہا۔
" نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" باس اور اس کے ساتھی چلائے۔
" نہیں کا کیا مطلب ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی کی
نہیں کا اثر لیا ہے۔" محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
" نہیں!" باس کے منہ سے نکلا۔

" بس تو پھر۔" محمُود نے کہا اور اشارہ کر دیا۔ تابڑ توڑ
پتھر برسنے لگے۔
ایسے میں فرزانہ نے محمود سے کہا:
" کیا ان سب کو موت کے گھاٹ اُتارنا ضروری ہے،
کم از کم چند ایک کو تو زندہ رہنا چاہیے۔ تاکہ بعد میں
تفصیلات معلوم کی جا سکیں۔ کہ یہ کیمپ کس طرح بنا۔ یہ باس
کون ہے۔ وغیرہ۔"
" تو کیا باس کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔" محمود نے کہا۔
" نہیں۔ باس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیوں کہ۔
ان لوگوں کے بڑے لوگوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اور
قانون ان کے مقابلے میں بے بس ہو جاتا ہے۔ اب
موقع ہے۔ دُنیا کی سزا اسے مل رہی ہے۔ آخرت میں
اللہ جو سزا دیں گے، وُہ الگ ہو گی۔"
" ٹھیک ہے۔ میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" فارُوق
نے کہا۔
پتھروں کی بارش میں چیخوں کا شور بھی شامل ہوتا رہا
اور پھر چیخیں آہستہ آہستہ دبتی چلی گئیں۔
" بس بھئی۔ ہاتھ روک دو۔ چند آدمی ہمیں ان میں
سے زندہ بھی مل جانے چاہییں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ

اس ریاست پر حملہ آور ہونے والے کون لوگ ہیں۔ وہ
تو ہمارے لیے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے ہیں۔"
" تو کیا ہم ساحل کی طرف چلیں۔"
" وہاں تو آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا ہو گا۔ ہمارا
وہاں کیا کام۔"
" ہو سکتا ہے۔ ہماری وہاں ضرورت ہو۔ ہمیں اس
جزیرے کی حکومت کا ساتھ تو ہرگز نہیں دینا چاہیے۔
لہٰذا ہم دوسروں کی مدد کریں گے۔"
" بات ٹھیک ہے۔ ہمارا یہاں کا کام مکمل ہو چکا ہے۔"
اب وہ تمام قیدیوں کو لے کر ساحل کی طرف چلے۔
جس قدر رائفلیں تھیں، وہ انھوں نے اُٹھا لیں۔ گولہ باری
کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی جا رہی تھیں:
" معلوم ہوتا ہے۔ جنگ زور شور سے جاری ہے۔"
" ہاں! کاش یہ حملہ ہمارے مُلک کی طرف سے ہوا ہو۔"
فرزانہ نے حسرت زدہ آواز میں کہا۔
" بھلا یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہمارے مُلک کی حکومت کو
یہاں کے حالات کیا معلوم؟" فارُوق بولا۔
" مجھے تو حیرت ابا جان پر ہے۔ انھیں جہاز پر ہماری
موجودگی کا احساس کیوں نہ ہوا۔"

" وُہ بھی آخر انسان ہیں۔ فرشتے نہیں۔ آخر انھیں کس
طرح معلوم ہو جاتا۔ ہاں! جو چیزیں ہم چھوڑ آئے تھے،
ان پر اگر ان کی نظر پڑ جاتی تو بات اور تھی۔"
آخر وُہ ساحل کے نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے دیکھا،
دُور بہت دُور جنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں چل رہی تھیں،
گولے پھٹ رہے تھے۔ اور یہ جنگ جزیرے کے
چاروں طرف ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید جزیرے کے
سب لوگ اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے۔ کیوں کہ
جزیرے پر کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے،
ان لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو کہیں چھپا دیا ہو:
" ہم جزیرے کے کسی اونچے درخت پر چڑھ کر یہ جان
سکتے ہیں کہ حملہ آور کون ہیں۔" محمود نے پُرجوش لہجے میں کہا۔
" ہوں! ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا اور فارُوق
کی طرف دیکھا۔
" میں سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر ایک بلند درخت
پر تیزی سے چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وُہ اس کی
چوٹی تک جا پہنچا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں پھر
اس کے منہ سے نکلا:
" ارے!"

"کیا ہوا؟"

"حملہ آور ہمارا اپنا مُلک ہے۔"

"وُہ مارا- مزا آ گیا۔"

"اب ہم کمر کی طرف سے ان لوگوں پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

فارُوق پیچھے آ گیا- اب وُہ اور آگے بڑھے- ایک جگہ انہیں مورچے بنے مل گئے- شاید جزیرے کی فوجوں نے پیچھے ہٹنے کی صُورت میں اپنے لیے بنائے تھے-

"یہی مورچے ہمارے کام آئیں گے- ان میں پوزیشن لے لو- رائفلوں والے اگلے مورچے میں اور پتھروں والے دوسرے مورچے میں- فی الحال وقت رائفلیں استعمال کرنے کا ہے- اگر دشمن کو ہماری طرف بڑھنا پڑا تو پھر ہم پتھر کام میں لائیں گے۔"

آن کی آن میں مورچے سنبھال لیے گئے- اور پھر فائرنگ کا آغاز ہوا- دشمن جو اس طرف سے بالکل بےفکر تھا- اور جنھیں ذرا بھی خطرہ نہیں تھا- وُہ بھی زد میں آ گئے اور گولیاں ان کی کمروں میں لگیں، جب تک وُہ خود کو سنبھالتے- دُوسری باڑھ ان کا مزاج پوچھ چکی

تھی- اب درمیان میں کھڑے جزیرے کے فوجیوں میں گھبراہٹ کے آثار نظر آئے-

اسی وقت دُوسری طرف سے بھرپُور حملہ کیا گیا- اور یہ حملہ اسی سمت میں کیا گیا جس طرف انھوں نے مورچے بنا رکھے تھے- بس پھر کیا تھا- دشمن اندھا دھند پیچھے کی طرف بھاگتا نظر آیا- اس طرف یہ تیار تھے- جونہی وُہ ان کی زد پر آئے- پتھروں کی بارش شروع ہو گئی- اس سے پہلے جب ان پر فائرنگ ہوئی تھی تو وُہ حیران اور پریشان ضرور ہوئے تھے- لیکن سامنے سے مُوت کو دیکھ کر وُہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے- اور یہ بھی بھول گئے کہ چند سیکنڈ پہلے تو ان پر پیچھے سے حملہ ہوا ہے؛ چنانچہ پتھروں کی زد میں آتے گئے اور گرتے چلے گئے-

دُوسری طرف سے ان کے مُلک کی فوج نے جب اس حصّے کی فوج کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو وُہ بھی سمندر سے خشکی پر آ گئے اور جزیرے کی طرف بھاگے- وُہ ساتھ ساتھ فائرنگ بھی کر رہے تھے- جزیرے کے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی- وُہ دائیں بائیں نکلنے کی کوشش کرنے لگے- آگے اور پیچھے سے تو ان پر فائرنگ ہو رہی تھی- نتیجہ یہ ہوا کہ

وُہ دائیں اور بائیں سے نکلتے چلے گئے۔ ان میں سے اکثر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دونوں فوجوں کے درمیان کوئی زندہ دشمن نہ رہا۔ اب وُہ آمنے سامنے آ گئے۔ ایسے میں محمود کے منہ سے نکلا:

"اوہو۔ اس فوج کی قیادت تو ابّا جان اور انکل خان رحمان کر رہے ہیں۔"

"ہم اس فوج کی صرف قیادت ہی نہیں کر رہے، یہ فوج ہے بھی ہماری اپنی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی ہاں! وُہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔" فارُوق مسکرایا۔

"نہیں! تم لوگ غلط سمجھے۔ تم کچھ نہیں دیکھ رہے۔ یا بالکل غلط دیکھ رہے ہو۔" خان رحمان مسکرائے۔

"جی۔ جی۔ کیا مطلب؟" فارُوق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہمارے ساتھی دراصل حکومت کے فوجی نہیں ہیں۔ یہ میرے سادہ لباس والے ہیں، جنھیں آج ہم ضرورت کے تحت فوجی لباس میں لائے ہیں، اس لیے کہ حکومت فوری طور پر اس جزیرے پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی، اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں تھیں۔ ان رکاوٹوں کو دُور کرنے میں وقت لگ جاتا۔ لیکن ہمارے پاس وقت

نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے یہی سوچا کہ اپنی فوج کو لے چلیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"لیکن آپ نے کیسے جان لیا کہ ہم جہاز پر تھے اور ہمیں یہاں اُتارا گیا ہے۔"

"یہ کام تمھاری شرارتوں نے کیا ہے۔"

"اوہ اچھا۔ آپ کا مطلب ہے۔ خوشبو نے۔ پنسل تراش نے۔ اور۔" فرزانہ جلدی جلدی بولی۔

"ہاں! اب آؤ۔ ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔"

انھوں نے جنگ پھر سے شروع کر دی؛ دُوسری سمتوں میں تو جنگ ہو ہی رہی تھی؛ تاہم جو کام ان کی سمت میں ہوا، اس نے اس جنگ کو اور آسان بنا دیا۔ جزیرے کے لوگ سمٹتے سمٹتے جزیرے کے بالکل درمیان میں آ کر جمع ہو گئے۔ وُہ مکمل طور پر چاروں طرف سے گھر چکے تھے۔ آخر انھوں نے ہتھیار پھینک دیے اور ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اب پورے جزیرے پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔

"ان کا باس کون ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"باس کو ہم ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ چند آدمی زندہ بچے ہیں۔ ان پر اس خیال سے گولیاں نہیں برسائیں کہ

معلومات حاصل کرنے کے کام آئیں گے۔"

" ہوں۔ خیر۔ ٹھیک ہے۔ باس کو تم نے اس لیے ٹھکانے لگا دیا ہوگا کہ کہیں اس کے بڑے بڑے سفارشی نہ نکل آئیں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

" جی ہاں! یہی بات ہے۔"

باس کی لاش کو ان کے سامنے لایا گیا۔ انسپکٹر جمشید نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا، لیکن کچھ اندازہ نہ لگا سکے۔

" ہے تو یہ ہمارے ہی مُلک کا۔ لیکن کون ہے۔ یہ میں نہیں جان سکا۔ شاید اکرام ہماری اس سلسلے میں مدد کر سکے۔"

" اوہ ہاں۔ اس معاملے میں انکل کی مہارت کی بھی داد دینی ہی پڑتی ہے۔"

دُوسرے مُلکوں کے قیدیوں کو ان کے مُلکوں میں پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔

پھر ان کی واپسی ہوئی۔ شہر میں غیر محسوس طریقے سے داخل ہونے کے لیے وُہ ایک ویران ساحل پر اُترے، ان کے ساتھ ان کے مُلک کے بے شمار مظلوم تھے۔ ان مظلوموں کو جلد از جلد ان کے گھروں تک پہنچانے کے

لیے انسپکٹر جمشید نے اپنے سادہ لباس والوں کو مقرر کر دیا، کیوں کہ وُہ جانتے تھے۔ انتظامیہ اس کام میں دن رات ایک نہیں کر سکتی تھی۔ اور اپنا لالچ بھی درمیان میں لے آتی۔ اس طرح مظلوم پریشان ہوتے۔

باس کی لاش کو اکرام کے سامنے لایا گیا۔ اکرام چند لمحے تک سوچتا رہا، پھر بولا:

" مجھے چند فائلیں دیکھنا ہوں گی، اس کے بعد میں کچھ بتا سکوں گا۔"

" تو ذرا جلدی دیکھ لو بھائی۔" انسپکٹر جمشید مُسکرائے۔

اکرام فائلیں لینے چلا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اب اس نے لاش کو پھر غور سے دیکھا اور فائلیں دیکھتا چلا گیا۔ آخر ایک فائل ان کے سامنے کھول دی:

" ہو نہ ہو۔ یہ بارنی ہے۔"

" بارنی!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

" جی ہاں بارنی۔ اس نے جرائم کا راستا بچے اغوا کرنے سے ہی شروع کیا تھا۔ دو تین بار یہ پکڑا بھی گیا، لیکن سفارشی آڑے آئے اور یہ سزا سے بچ گیا۔ اور پھر بالکل غائب ہوگیا۔ کئی سالوں بعد یہ اب نظر آیا ہے۔ گویا اس نے اس جزیرے میں پناہ لے

لی تھی۔ اور اپنے گھناؤنے کاروبار کے لیے اس جزیرے کی حکومت سے بات کی تھی۔ پتھروں سے اس جزیرے کی حکومت کو بہت زبردست آمدنی تھی، لیکن یہ آمدنی حاصل کرنے کے لیے انھیں خرچ بھی بہت کرنا پڑتا تھا، چنانچہ جزیرے کی حکومت نے اسے کیمپ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ بچے اغوا کرنے کا تجربہ اسے ہو ہی چکا تھا۔ اس نے ضرور ایسے آدمیوں کو تربیت دی ہو گی جو بچوں کو اس کے کیمپ تک لا سکیں۔ اس طرح نہ جانے یہ سلسلہ کب سے جاری ہے۔ اُف مالک کتنا بڑا ظلم ہے یہ۔ آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ اسے ختم کر دیا۔ ورنہ ضرور پھر اسے بچانے کی کوشش کی جاتی۔ ایسے لوگوں کے تعلقات ضرور بڑے بڑے لوگوں سے ہوتے ہیں۔"

"اور جب تک وُہ بڑے لوگ گرفتار نہ ہوں۔ اس وقت تک اس قسم کے جرائم نہیں رُک سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے سر۔ اب تو یہ ہلاک ہو چکا ہے۔ اس کی سفارش کے لیے کون آئے گا۔" اکرام نے کہا۔

"اس لحاظ سے یہ ابھی نہیں مرا۔ اس کے سفارشی ضرور آئیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب؟" وُہ چونکے۔

لیکن انسپکٹر جمشید نے اس بات کی وضاحت نہیں کی۔ بس مُسکرا دیے۔ دُوسرے دن کے اخبارات میں بارنی کے جُرم کی تفصیلات شائع ہوئیں۔ خبروں میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ بارنی کو انسپکٹر جمشید گرفتار کر کے دارالحکومت لے آئے ہیں۔

اب وُہ سمجھے کہ انھوں نے یہ کیوں کیا تھا۔ اور پھر پہلے فون کی گھنٹی بجی:

"ہیلو انسپکٹر صاحب۔ کریم جیلانی بول رہا ہوں۔ عوام کا نمایندہ۔"

"اوہ۔ آپ ہیں سر۔ فرمایئے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" وُہ بولے۔ کریم جیلانی ایک سیاست دان تھا۔ اس کی باقاعدہ ایک پارٹی تھی۔ وُہ اس پارٹی کا صدر تھا۔ اور یہ پارٹی مُلک میں کافی مقبول تھی۔

"ہاں انسپکٹر صاحب۔ مَیں نے سُنا ہے۔ بارنی کو آپ نے گرفتار کیا ہے۔"

"تو پھر۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں — اس سے نرمی کی جائے۔ کچھ دن جیل میں رکھ کر — جب لوگوں کے ذہنوں سے اس کا خیال نکل جائے — اسے رہا کر دیا جائے۔"

"لیکن ہم ایسا کیوں کریں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس لیے کہ میرے اس سے بہت قریبی تعلقات ہیں، وہ بہت اچھا آدمی ہے — غلطی سے اس پیشے میں پڑ گیا ہے — یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"نہیں مسٹر جیلانی — غلط فہمی کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے۔"

"چلیے خیر — نہیں ہوگا امکان — ہمارے ملک میں بڑے بڑے مجرم چھوٹ جاتے ہیں — اگر ایک اس کو چھوڑ دیا گیا تو کیا ہو جائے گا؟"

"ہاں! جناب — یہ ٹھیک ہے — ہمارے ملک میں بڑے بڑے مجرم چھوٹ جاتے ہیں — بارنی کا معاملہ اس وقت مکمل طور پر میرے ہاتھ میں ہے — لہٰذا آپ میرے گھر آ کر مجھ سے بات کر لیں۔"

"اوہ ضرور ضرور — کیوں نہیں — میں ابھی حاضر ہو رہا ہوں۔" دوسری طرف سے پُر جوش انداز میں کہا گیا۔

"شکریہ!" انھوں نے کہا اور فون کا ریسیور رکھ دیا۔ جلد ہی پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اُنھوں نے ریسیور اُٹھایا اور بولے:

"انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔"

"اور میں سر ماجد ہوں۔"

"اوہ — آپ ہیں سر — فرمائیے — کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" انھوں نے چونک کر کہا، یہ شخص قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔

"بارنی کی سفارش کروں گا آپ سے۔"

"اوہ! میں سمجھا — خیر آپ تشریف لے آئیں۔"

"کہاں — آپ کے گھر؟"

"جی ہاں! اس کام کے لیے میرا گھر ہی مناسب رہے گا۔"

"بہت بہتر — میں اسی وقت آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

ریسیور رکھ کر انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑے:

"ہمیں دو بڑے حضرات کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے — دونوں بارنی کے سفارشی ہیں۔"

"ہوں! لیکن آپ ان سے کیا بات کریں گے؟"

"بس دیکھتے جاؤ۔"

"دیکھ تو خیر، ہم رہے ہی ہیں" فاروق نے کڑھتے ہوئے کہا۔ پندرہ منٹ بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ محمود نے دروازہ کھولا اور پھر وُہ کریم جیلانی کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"آئیے جناب۔ تشریف رکھیے" انسپکٹر جمشید نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

"بہت بہت شکریہ۔ انسپکٹر صاحب آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں نے تو آپ کے بارے میں بہت غلط غلط باتیں سُنی تھیں"

"جی بس۔ کیا بتاؤں" وُہ شرما گئے۔

جلد ہی سر ماجد بھی آ گئے۔ سر ماجد کریم جیلانی کو، کریم جیلانی سر ماجد کو دیکھ کر چونکے، پھر دونوں ایک ساتھ بولے:

"او ہو۔ آپ"

"جی ہاں! آپ دونوں" انسپکٹر جمشید مُسکرائے۔

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔ آپ بھی بارنی کی سفارش لے کر آئے ہیں" سر ماجد بولے۔

"ہاں! اور آپ بھی" کریم جیلانی مسکرائے۔

"ہُوں! خیر۔ اب ہم مل کر انسپکٹر صاحب سے بات کر لیتے ہیں" یہ کہہ کر سر ماجد ان کی طرف مڑے:

"انسپکٹر صاحب۔ میں بہت صاف گو آدمی ہُوں۔ وقت بھی ضائع نہیں کروں گا۔ بے تکلّف ہو کر فرمائیے، آپ اس کام کے لیے کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

"کیا آپ بھی یہی پُوچھنا چاہتے ہیں کریم جیلانی؟"

"ہاں بالکل!"

"اور آپ دونوں الگ الگ مجھے رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ہم دونوں کی رقم ملا کر بتا دیں۔ یا الگ الگ"

"رقم بتانے سے پہلے میں صرف ایک بات پُوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اس سوال کا جواب دے دیا تو پھر شاید میں رقم لیے بغیر ہی مسٹر بارنی کو رہا کرا دوں"

"اوہ۔ اور وُہ بات کیا ہے؟" سر ماجد نے چونک کر کہا۔

"صِرف اتنی سی بات بتا دیں کہ آپ کو بارنی سے ہمدردی کیا ہے؟"

"ہمدردی۔ بس یُوں سمجھ لیں کہ انسانی ہمدردی ہے" سر ماجد بولے۔

"انسانی ہمدردی تو پھر آپ کو ان سے زیادہ ہونی چاہیے جن پر ظلم ہوتا رہا"

"ہاں! ہمیں ان سے بھی ہمدردی ہے، لیکن وہ تو اب اپنے گھروں کو پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں جناب! میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں — آپ کو اصل بات بتانا ہوگی۔"

"اصل بات" دونوں ایک ساتھ بولے۔

"ہاں! جب تک آپ دونوں اصل بات نہیں بتائیں گے، اس وقت تک میں بارنی کے لیے کچھ نہیں کروں گا — بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آپ کے لیے کچھ نہیں کروں گا۔"

دونوں سوچ میں پڑ گئے — آخر سر ماجد نے کہا:

"انسپکٹر صاحب! اب آپ سے کیا چھپانا — وہ ہمیں ماہانہ ادا کرتا ہے۔"

"ماہانہ — یعنی ماہانہ کوئی بڑی رقم ادا کرتا رہا ہے۔" انھوں نے وضاحت چاہی۔

"ہاں! یہی بات ہے — دراصل جزیرے میں بارنی کے پاس زیادہ تعداد ہمارے ملک کے افراد کی تھی — تھوڑے سے لوگ دوسرے ملکوں کے بھی تھے — ملک میں اس کے لیے اغوا کرنے والوں کو تحفظ دینا ہمارے ذمے تھا۔" کریم جیلانی نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ — تب تو — تب تو" انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک

گئے۔

"تب تو کیا؟"

"تب تو آپ بھی برابر کے شریک ہیں اس جرم میں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟"

"وہ یہ گھناؤنا کاروبار آپ کی مدد سے کرتا رہا ہے — لہذا آپ کو بھی سزا ملنی چاہیے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب — ہم آپ کو بھی رشوت پیش کرنے آئے ہیں۔" کریم جیلانی بولے۔

"اوہ ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا — خیر — آپ مجھے کتنی رقم دے سکتے ہیں؟"

"ایک لاکھ روپے — دو لاکھ روپے — آپ کتنی رقم چاہتے ہیں۔"

"آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا — میں وہ انسپکٹر نہیں جو معمولی معمولی رقموں پر بک جاتے ہیں۔"

"تب پھر — آخر آپ کتنی رقم چاہتے ہیں۔"

"آپ دونوں مل کر اپنی تمام رقم بھی دے دیں، تب بھی میں بارنی کی سزا میں کمی نہیں کرا سکتا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"اس لیے کہ بارنی کو پہلے ہی اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔ اب دُنیا کی کوئی عدالت اسے سزا نہیں دے سکتی۔" انھوں نے کہا۔

"آپ۔ کیا۔ کہنا چاہتے ہیں؟"

"لڑائی کے دوران بارنی بھی مرچکا ہے۔"

"ارے۔ تو پھر آپ نے اسے زندہ کیوں ظاہر کیا۔" سر ماجد نے تلملا کر کہا۔

"میں اصل مجرموں کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔"

"اصل مجرم۔ کیا مطلب۔ اصل مجرم کون ہے؟"

"آپ۔ اور آپ جیسے دُوسرے۔ آپ لوگ اگر ایسے لوگوں کی کمر پر نہ ہوں تو یہ گھناؤنے کاروبار پنپ نہیں سکتے۔"

"آپ ہماری توہین کر رہے ہیں۔ خیر۔ ہم آپ سے سمجھ لیں گے۔ بہت جلد آپ کی جواب طلبی ہو گی۔" دونوں بھنا کر اُٹھ گئے۔

"میری جواب طلبی کرنے والے بھی یہاں موجود ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمام ذمّے دار لوگ دُوسرے کمرے میں

موجود ہیں اور یہاں ہونے والی گفت گو سُن رہے ہیں۔ اب آپ لوگ بھی تشریف لے آئیں۔" انھوں نے بغلی دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔

دروازہ کھُلا اور آفیسر حضرات آتے نظر آئے۔ ان سب کو دیکھ کر دونوں کے رنگ اڑ گئے، پھر اچانک کریم جیلانی نے کہا:

"آپ لوگ عدالت میں کیا ثبوت پیش کریں گے؟"

"عدالت اگرچہ ہم سب کے بیانات کو مسترد نہیں کر سکتی؛ تاہم ہم نے احتیاطاً اس کمرے میں ہونے والی گفت گو کو ٹیپ بھی کیا ہے۔ لہٰذا اب آپ لوگ بچ نہیں سکتے۔" آئی جی صاحب بولے۔

دونوں کے سر جھک گئے، پھر ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد محمود نے کہا:

"ابھی ایک اور مرحلہ باقی ہے۔"

"اوہ ہاں! میں سمجھ گیا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ خیر میں اکرام کو بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں اباجان۔ ہم ذرا ان پر دُوسرے طریقے سے ہاتھ ڈالنا پسند کریں گے۔"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔" وہ بولے۔

اور تینوں خوشی سے مسکرا دیے۔ دوسرے دن صبح سویرے وہ بندرگاہ پر موجود تھے، بلکہ ہلکی قسم کے میک اپ میں، اس سے پہلے وہ اس جہاز کی روانگی کے بارے میں معلوم کر چکے تھے۔ انھوں نے دیکھا۔ ایک آدمی ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نزدیک پہنچنے پر انھوں نے جان لیا۔ وہ زوبی تھا۔ اس نے ان کے نزدیک پہنچ کر کہا:

"کیا آپ لوگ جہاز کی سیر کرنا پسند کریں گے؟"

جہاز کا کیس

"ہاں! آئے تو اسی ارادے سے ہیں۔" محمود نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر۔ میں آپ جیسے بچوں کو جہاز کی سیر بہت اچھے طریقے سے کراتا ہوں۔ جہاز کا ایک ایک گوشہ دکھاتا ہوں۔"

"لیکن آپ دوسروں کے لیے اتنی تکلیف کیوں کرتے ہوں؟"

"یہ میرا پیشہ ہے۔ میں اس کا باقاعدہ معاوضہ لیتا ہوں۔ آپ تینوں سے صرف نوے روپے لوں گا۔ تین اور بچے تیار ہیں۔ انھیں اور آپ کو ایک ساتھ سیر کراؤں گا۔ اس طرح میرے ایک سو اسی روپے بن جائیں گے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ ہمیں منظور ہے۔"

وہ انھیں جہاز پر لایا۔ یہاں تین بچے بے تابانہ انتظار کر رہے تھے۔ وہ کانپ اٹھے۔ اگر حالات پہلے جیسے

ہوتے۔ تو یہ بے چارے تو گئے تھے کام سے۔

زوبی اور زیٹی کو ابھی جزیرے کی کایا پلٹ کا کوئی علم نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی بحری جہاز روز نہیں جاتے تھے۔ تیسرے دن ان اطراف میں ایک جہاز جاتا تھا، سیر شروع ہوئی۔ پہلے اوپر والی منزل دیکھی گئی۔ پھر درمیان والی اور اس کے بعد تیسری۔

نچلی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی زوبی نے دروازہ بند کر لیا:

"یہ۔ یہ کیا بھئی۔"

"کچھ نہیں۔ ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

"کیا مطلب؟"

"فکر نہ کرو۔ بہت پُر سکون پروگرام ہے۔ آجاؤ بھئی زیٹی۔" یہ کہہ کر اس نے چٹخنی کھول دی۔

دروازہ کھلا اور زیٹی اندر داخل ہوا۔

"کیا ارادہ ہے دوستو۔" محمود بولا۔

"کوئی خاص نہیں۔ بس تم لوگوں کو لکڑیوں کی ان پیٹیوں میں بند کرنا ہے۔"

"لیکن کیوں۔ کیا پروگرام ہے؟"

"جہاز کی سیر کر لو گے اس بہانے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" دوسرے تینوں بچے چلائے۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں دوستو۔ یہ تم لوگوں کو پیٹیوں میں بند نہیں کر سکتے۔"

"کیا کہا۔ نہیں کر سکتے۔ اچھا۔" زیٹی چہکا۔

"ہاں نہیں کر سکتے۔ ہماری طرف دیکھو۔ ہم تمہیں نظارہ دکھانے آئے ہیں۔"

"اوہو۔ تو تم لوگ بھی ہمیں نظارہ دکھاؤ گے۔" زوبی مسکرایا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ ایسا نظارہ کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی تینوں نے اپنے میک اپ اتار دیے۔ زوبی اور زیٹی بہت زور سے اچھلے۔ ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"تت۔ تم۔ تم۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! ہم وہی ہیں جنہیں تم پہلے بھی پیٹیوں میں بند کر چکے ہو۔ فکر نہ کرو۔ ہم ان کی روحیں نہیں ہیں۔"

"شاید تم کسی طرح بچ نکلے ہو۔ خیر۔ اس بار نہیں بچو گے۔"

"اب اس جزیرے پر ہمارا کنٹرول ہے۔ جزیرے کی حکومت کا ہم صفایا کر چکے ہیں۔" محمود بولا۔

"ہاں! ہم میں یہی بُری بات ہے۔ کہ جہاں جاتے ہیں۔ وہاں کا صفایا ضرور کرتے ہیں۔"

"پتا نہیں۔ تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔"

"بس ایک اوٹ پٹانگ بات اور سُن لو۔ پہلے بھی ہم تم لوگوں کو یہیں۔ اسی جگہ سبق سکھا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے صرف اس لیے پیٹیوں میں بند ہونا منظور کر لیا کہ معلوم ہو تو۔ تم لوگ کرنا کیا چاہتے ہو۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔"

یہ کہہ کر محمود نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور زیٹی کی ناک پر ایک مُکّا رسید کر دیا۔ ساتھ ہی اس کے بائیں ہاتھ کی ہڈی زوبی کی دائیں کلائی پر پڑی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جسے فارُوق نے کیچ کر لیا۔

زیٹی، زوبی اور تینوں بچے حیرت زدہ تھے، پھر زیٹی نے غصّے میں آ کر محمود پر چھلانگ لگائی۔ وُہ ذرا سا سرک گیا۔ زیٹی منہ کے بل فرش پر گرا۔

"دیکھ کر بھئی۔ تمہیں تو گرنا بھی نہیں آتا۔"

اب وُہ دُور کھڑے انھیں کھا جانے والی نظروں سے

دیکھ رہے تھے۔

"آؤ بھئی۔ تھک گئے کیا۔" فارُوق نے شوخ آواز میں کہا۔

لیکن انھوں نے پھر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔ یہ دیکھ کر محمود بولا:

"فرزانہ دروازہ کھول کر انکل اکرام کو اندر بلا لو۔ انھوں نے ہار مان لی ہے۔ اب انھیں اپنے مظالم کا حساب دینا ہو گا۔"

اکرام اور اس کے ماتحتوں نے اندر آ کر انھیں قابو کر لیا۔ اب ان کی حیرت اور بڑھ گئی۔ پھر تو سارے جہاز میں یہ خبر پھیل گئی۔ کپتان دوڑتا ہوا آیا۔ اسے ساری بات بتائی گئی تو اس کا رنگ اڑ گیا۔

"اُف مالک۔ ہمارے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ ایسا بھی ہوتا رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں! ہم نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ آپ اس تجارت میں ان کے ساتھ نہیں ہیں۔"

جہاز سے رُخصت ہو کر وُہ گھر کی طرف روانہ ہوئے:

"میں سوچ رہا ہوں۔ ہم اس کیس کا نام کیا رکھیں۔" محمود بولا۔

"جہاز کا کیس۔" فرزانہ فوراً بولی۔

"ارے! یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔"

"میں نے ناول کا نہیں۔ کیس کا نام بتایا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم مصنف نہیں ہیں جنہیں ناولوں کے ناموں کی تلاش ہوتی ہے۔" فرزانہ نے بُرا مان کر کہا۔

"چلو مان لیا۔ ہم مصنف نہیں ہیں، لیکن ہمارے ان کیسوں کو کوئی سر پھرا مصنف ناول کے رنگ میں لکھ تو سکتا ہے۔ اور جب وہ لکھے گا تو اسے اس ناول کا ایک عدد نام بھی رکھنا پڑے گا۔ لہٰذا اس طرح نام تجویز کر کے ہم اس کی مدد بھی کریں گے۔ اور دُوسروں کی مدد کرنا کوئی بُری بات نہیں۔" فارُوق نے جلدی جلدی کہا۔

"اچھا بھائی۔ بیٹھ کر تجویز کرتے رہو تمام دن ناولوں کے نام۔"

"میرا سر نہیں پھر گیا کہ تمام دن یہ کام کرتا رہوں، یہ تو بس بات نکل آئی اور نام منہ سے نکل گیا۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"یوں تو پھر اور نام بھی تجویز کیے جا سکتے ہیں۔" محمود مسکرایا۔

"اجازت ہے۔ تم اپنی پسند کا نام تجویز کر سکتے ہو۔ اور فرزانہ اپنی۔"

"میری تو کرتی ہے جُوتی۔ نام تجویز۔"

"لو محمود اور سُنو۔ اب ان کی جُوتی بھی یہ کام کرے گی۔ پہلے خود تیار نہیں تھی۔" فارُوق نے شوخ انداز میں کہا۔

محمود کی ہنسی نکل گئی۔ فرزانہ فارُوق کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی۔

باغی کیمپ

کا انعامی سلسلہ

○ ناول آپ نے پڑھا، اب فوراً اس پر اپنی رائے لکھیے۔

○ سب سے پہلے موصول ہونے والے دو خطوط پر ۵۰، ۵۰ روپے کا نقد انعام روانہ کیا جائے گا۔

○ ان کے بعد پہلے موصول ہونے والے آٹھ خطوط پر ادارہ اپنی پسند کی ۵، ۵ کتابوں کے پیکٹ بطورِ انعام روانہ کرے گا۔

○ یہ دس خط آیندہ ماہ کے ناول کے آخر میں اسی ترتیب سے شائع ہوں گے جس ترتیب سے موصول ہوں گے۔

○ یہ ضروری نہیں کہ خط ناول کی تعریف میں ہو۔ ناپسندیدگی کا بھی ہو سکتا ہے۔

○ یہ خطوط اس پتے پر ارسال کریں:
اشتیاق احمد، وی ۶/۸ شیلائٹ ٹاؤن، جھنگ صدر

○ لفافے کے اوپر بریکٹ میں انعامی سلسلہ ضرور لکھیں۔ (انعامی سلسلہ)

آیندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۷۶

کیسے کیسے سانپ

—— مصنف: اشتیاق احمد ——

○ انسپکٹر جمشید کو رات کے ایک بجے ایک خوفناک فون ملا۔

○ وہ جلدی میں محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی ساتھ نہ لے جا سکے۔

○ محمود، فاروق اور فرزانہ بھلا کہاں رکنے والے تھے۔ وہ بھی وہاں پہنچ گئے، لیکن ——

○ ایک بہت بڑے ملک کے ایک بہت بڑے آدمی کی کہانی ——

○ جو اس ملک کا باغی ہو گیا تھا۔ وہ کہاں تھا۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ اور جب اس راز سے انسپکٹر جمشید نے پردہ اٹھایا۔

○ آخر میں مجرم کو کس انوکھے طریقے سے پکڑا گیا۔

قیمت: ۶/۵۰ روپے

آیندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۷۷

نامعلوم سائنس دان

— مصنف: اشتیاق احمد —

- ○ انسپکٹر جمشید کی ایک اچانک طلبی —
- ○ ایک خطرناک مہم ان کے ذمے لگائی گئی —
- ○ اس مہم نے انھیں ناکوں چنے چبوا دیے —
- ○ کامیابی کے آثار آخر تک آپ کو نظر نہیں آئیں گے —
- ○ لیکن وہ بھی انسپکٹر جمشید تھے —
- ○ محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی ان کا خوب ہی ساتھ دیا —
- ○ ایک ایسا ناول جو آپ کو مدتوں یاد رہے گا —
- ○ ایک خاص نمبر کا مزا آ جائے گا —

قیمت: ۶/۵۰ روپے

آیندہ ناول کی ایک جھلک

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران مرزا سیریز ۶۸

خواب کی تلاش

— مصنف: اشتیاق احمد —

- ○ تین سال بعد وہ جیل سے نکلے تو ایک اجنبی آواز نے انھیں چونکا دیا —
- ○ انھوں نے ایک سنگین جرم کیا تھا — لیکن کیوں؟
- ○ وہ شکار کھیلنے نکلے تھے، لیکن جنگل میں انھیں چند گھوڑسواروں نے گھیر لیا —
- ○ انھیں جنگل کے نواب کے سامنے پیش کیا گیا —
- ○ جنگل کا نواب — جو کچھ اور بھی تھا —
- ○ ایک چالاک مجرم — جو انجانے خوف میں مبتلا تھا —

قیمت: ۶/۵۰ روپے

آیندہ ناول کی ایک جھلک

شوکی سیریز ۵۰

سیاہ پلیٹ

مصنف: اشتیاق احمد

- ○ شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر ملاحظہ فرمائیں —
- ○ جلالی نور نے انھیں ایک کیس حل کرانے کے لیے بلایا تھا —
- ○ انھوں نے معاوضہ لیے بغیر کیس حل کرنے سے انکار کر دیا —
- ○ اور پھر جلالی نور انھیں پانچ ہزار روپے معاوضہ دینے پر مجبور ہو گیا —
- ○ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی — آخر کیوں؟
- ○ اس بار شوکی برادرز حیرت انگیز طور پر آگے بڑھتے ہیں — جیب سے خرچ کرتے ہیں، لیکن کیس انھیں پھر بھی مہنگا نہ پڑا —
- ○ آپ بے ساختہ مسکرائیں گے —

قیمت: ۶/۵۰ روپے

آیندہ ناول کی ایک جھلک

انسپکٹر ارسلان سیریز ۲۴

طاقت کی زبان

مصنف: آفتاب احمد

- ○ انسپکٹر ارسلان نے صدرِ مملکت کے سامنے ایک پروگرام رکھا —
- ○ پوری دُنیا کے ٹی وی اسٹیشنوں پر ایک شخص کی آواز گونج رہی تھی — وہ آواز کس کی تھی —
- ○ پوری دُنیا اس بات سے بے خبر تھی کہ پاک لینڈ کے ساتھ والے مُلک میں کیا ہو رہا ہے —
- ○ پاک لینڈ کی فوج کا ایک عظیم کارنامہ —
- ○ جب انسپکٹر ارسلان کا پروگرام دُنیا کے سامنے آیا تو دُنیا کی بڑی بڑی طاقتیں دانتوں تلے اُنگلی دبا کر بیٹھ گئیں —
- ○ آخر میں آپ کہ اُٹھیں گے کہ کیا ایسا ممکن ہے؟

قیمت: ۶/۵۰ روپے

آیا۔ اس ناول میں انسان کا جو لالچی پن دکھایا گیا ہے، وُہ ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ یہ ناول پڑھ کر دل میں لالچ سے نفرت اور بڑھ گئی ہے۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔

افتخار احمد، مکان نمبر ڈی ۰۲/۱۲/۰ محلہ کرتار پورہ، راولپنڈی

(۹)

ڈیر انکل اشتیاق احمد

السلام علیکم! گیند کا طوفان پڑھ کر حیرت میں ڈوب گئے، ایک چھوٹی سی گیند بھی کسی کی مَوت کا سبب بن سکتی ہے۔ گیند کے استعمال کا طریقہ پڑھ کر آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آپ نے صحیح لکھا ہے کہ لالچ بُری بلا ہے۔ لالچ کی خاطر ایک بھائی نے دُوسرے بھائی کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

ثاقب مسعود، حسن محمود، مکان نمبر ۹۴۶/ڈی، بلال ٹاؤن، جہلم

(۱۰)

پیارے انکل

السلام علیکم! گیند کا طوفان پڑھا۔ اس دفعہ تو پروفیسر داؤد کے سر سہرا باندھنا چاہیے، کیوں کہ اگر وُہ گیند کو دیکھ کر نہ چونکتے تو وُہ گیند جواری ماٹا کے پاس چلی جاتی اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ ناول تجسس سے بھرپُور تھا۔

تسکین مقصود خواجہ، مکان نمبر ۳۹۶/۲۴، گلی نمبر ۳، محلہ دھاروال، سیالکوٹ شہر

عیسائیت کو چیلنج

★★★★★★★

قارئین کرام! جب سے مَیں نے ناولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے خلاف دو صفحات شائع کرنا شروع کیے ہیں، مجھے طرح طرح کے خطوط لکھے جانے لگے ہیں۔ ان خطوط میں یہ دعویٰ زور شور سے کیا جاتا ہے کہ ہماری کسی انجیل میں دُوسری کے مقابلے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب انجیلیں ایک جیسی ہیں۔ تو صاحبان لیجیے ملاحظہ فرمائیے۔ ہر انجیل دُوسری سے مختلف ہے یا نہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون پڑھ کر میرے قارئین تو جان ہی لیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔ دُعا ہے، عیسائی حضرات کو بھی اللہ تعالیٰ عقل عطا فرما دے اور وُہ اسلام کی گود میں آجائیں ________ آمین!

انجیلوں کی حیثیت

ولادتِ مسیح اور انجیلوں کا اختلاف

مُوجُودہ دَور کے عیسائیوں کی متفقہ انجیلوں (متی،

مرقس، لوقا، یوحنا) میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں متضاد بیانات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت بغیر باپ کے ہوئی، لیکن اس کی جو روئیداد مذکورہ انجیلوں میں پائی جاتی ہے وہ عیسائیوں کے اس عقیدے کی تردید کرتی ہے۔

انجیلوں میں جناب حضرت مسیح علیہ السلام کا جو تعارف بیان کیا گیا ہے کسی بھی طور پر حضرت مریم کی عصمت و عفّت اور حضرت مسیح علیہ السلام کی معصومیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

جعلی انجیلیں

بلکہ دونوں کے تقابل سے ظاہر ہوگا کہ موجودہ انجیلوں کے بیانات جھوٹ اور بہتان کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتے اور عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ انجیلیں الہامی اور اصلی ہیں، ان میں کسی قسم کا تحریف و تصرّف نہیں کیا گیا، قطعاً غلط اور حقیقت سے دُور ہے۔ اس داخلی شہادت کے علاوہ مسیحی اکابرین کی ناقابلِ تردید تحریروں سے بھی موجودہ مروجہ انجیلوں کا جعلی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

انجیلوں کا باہمی تضاد

اختلافِ اوّل: چنانچہ جو واقعات حضرت مسیح علیہ السلام کی

پیدائش کے، انجیلوں میں سے انجیل متی اور انجیل لوقا میں پائے جاتے ہیں، ان کا آغاز حضرت مریمؑ اور یوسف نجار کی منگنی کی نسبت سے ہوتا ہے؛ چنانچہ انجیل لوقا میں اس کا مصنف لوقا لکھتا ہے:

"چھٹے مہینے میں جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا، ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نامی سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا اور فرشتے نے اس کے پاس اندر آکر کہا: اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا اس کا نام یسوع رکھنا۔"

انجیل لوقا، باب ۱ فقرہ ۲۶ تا ۳۱ یعنی ۱: ۲۶-۳۱

یعنی لوقا کے اس بیان کے مطابق جبرائیل فرشتہ حضرت مریمؑ کے پاس آکر اسے حضرت مسیحؑ کی پیدائش کی خوش خبری سناتا ہے، لیکن اس کے برعکس انجیل متی میں اس کا مصنف لکھتا ہے:

"مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ رُوح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا، اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے

فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا: اے یوسف ابنِ داؤد
اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیوں کہ جو
اس کے پیٹ میں ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے ہے،
اس کے بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا۔" انجیل متی ۱: ۱۸-۲۱

قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ لوقا اور متی کے مذکورہ بالا بیانات
میں کس قدر تضاد ہے۔ لوقا کے نزدیک جبرائیل فرشتہ حضرت
مریم کے پاس آتا ہے اور متی کے نزدیک یوسف کے پاس آتا
ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو باتوں میں سے ایک بات قطعاً جھوٹ
پر مبنی ہے۔

اختلافِ دوم: مذکورہ مصنفین حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب نامہ
میں بھی متفق نہیں ہیں؛ چنانچہ متی اور لوقا کے بیان کردہ دونوں
نسب ناموں کے چند اختلافات کو قارئین ملاحظہ فرمائیں:

انجیل متی میں ہے: یسوع مسیح بن یوسف بن یعقوب۔

انجیل لوقا میں ہے: یسوع (مسیح) یوسف کا بیٹا تھا اور وہ عیلی کا۔

اختلافِ سوم: انجیل متی سے معلوم ہوتا ہے یعقوب کا باپ متان
تھا۔ لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ متات تھا۔

اختلافِ چہارم: متی میں متان کا باپ الیعزر اور لوقا میں متات
کا باپ لاوی ہے۔

اختلافِ پنجم: انجیل متی میں الیعزر سے زربابل تک آٹھ باپ

ذکر کیے گئے ہیں اور لوقا میں متات کے بعد لاوی سے زربابل
تک سترہ باپ بنائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوقا نے حضرت مسیحؑ
کے نو باپ بڑھائے ہیں۔ مزید ستم یہ کہ زربابل سے نیچے الیعزر
یا لاوی تک کے درمیان کے نام ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اختلافِ ششم: انجیل متی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ حضرت
سلیمانؑ بن داؤدؑ کی اولاد سے ہیں، لیکن لوقا سے معلوم ہوتا ہے
کہ آپ حضرت ناتن بن داؤدؑ کی اولاد سے ہیں۔

اختلافِ ہفتم: انجیل متی میں زربابل کے بیٹے کا نام ابی ہود
لکھا ہے، لیکن انجیل لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام ریسا ہے۔

نوٹ: زربابل کے کسی بیٹے کا نام ابی ہود ہے نہ ریسا، دیکھیے اوّل
تواریخ ۳: ۱۹ حق بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں غلط ہیں۔

اختلافِ ہشتم: متی اپنی انجیل کا آغاز ہی "یسوع مسیح ابن داؤد
ابن ابراہام کا نسب نامہ" کے الفاظ سے کرتا ہے اور حضرت مسیح
کی بیالیس پشتوں کے نام گنوانے کے بعد ان ناموں کو تین ادوار
میں اس طرح تقسیم کرتا ہے:

"پس سب پشتیں ابراہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہوئیں
اور داؤد سے لے کر گرفتار ہو کر بابل جانے تک چودہ
پشتیں اور گرفتار ہو کر بابل جانے سے لے کر مسیح تک
چودہ پشتیں ہوئیں۔" انجیل متی ۱: ۱-۱۷

متی نے اگرچہ تیسری تقسیم میں بھی چودہ پُشتوں کے نام ذکر ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ تیسری تقسیم میں بارہ پُشتوں کے نام ذکر کیے ہیں۔ اگر اس تیسری تقسیم میں واقعی چودہ پُشتیں تھیں تو اس وقت موجودہ انجیل میں چودہ کی بجائے بارہ نام پائے جاتے ہیں۔ بہر حال قطع نظر اس کے کہ اگر متی کی یہ بات تسلیم کر لی جائے جو اسی باب کی آیت سولہ میں لکھی گئی ہے کہ:

"یعقوب سے یُوسف پیدا ہوا۔ یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے۔"

اگر اس کا مطلب یُوسف نجار کو حضرت مسیح کا حقیقی باپ لیا جائے تو نسب نامہ کے بیالیس نام (بزعم متی) تو پورے ہوتے ہیں، لیکن اسی باب کی اٹھارہویں آیت غلط ثابت ہوتی ہے کہ:

"مریم اور یُوسف کے ملاپ سے پہلے مریم حاملہ پائی گئی۔"

اس کے بالمقابل لوقا اپنی انجیل میں حضرت مسیح کے جس نسب نامے کا ذکر کرتا ہے نہ صرف یہ کہ اس کا نسب نامہ متی کے بیان کردہ نسب نامے سے مختلف ہے، بلکہ آغاز وہ اس طرح کرتا ہے:

"جب یسوع تعلیم دینے لگا قریباً تیس برس کا تھا اور (جیسا کہ سمجھا جاتا تھا) یُوسف کا بیٹا تھا اور وہ عیلی کا۔" لوقا ۳:۲۳

○

نوٹ: مضمون جاری ہے، باقی آئندہ ماہ کے کسی ناول کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔